عشاق کے قافلے

25

عبداللہ جان جمالدینی

(8 مئی 1922.....19 ستمبر 2016)

شاہ محمد مری

جملہ حقوق بحقِ سنگت اکیڈمی محفوظ ہیں

ضابطہ:

نام کتاب	.....	عبداللہ جان جمالدینی
مصنف	.....	شاہ محمد مری
موضوع	.....	سوانح
پہلی اشاعت	.....	2007
دوسری اشاعت	.....	2017
تعداد	.....	1000
قیمت	.....	300 روپے
پبلشر	.....	سنگت اکیڈمی
فون نمبر	.....	03003829300

ISBN: 978-969-8957-28-5

ملنے کا پتہ:

سنگت اکیڈمی

206، مری لیب، فاطمہ جناح روڈ، کوئٹہ۔

فون:+92-81-2843358

email: books@sangatacademy.net

Web: www.sangatacademy.net

انتساب

سی آر اسلم کے نام
جس نے بے شمار انسانوں کو
سماجی سائنس کے علم سے منور کیا

جس کے فیض نے بہت سوں کو بھٹکنے کی عمر
میں بھٹکنے نہ دیا

جس نے اپنے دوستوں کو کمٹ منٹ کے
ریشمی دھاگے میں پروئے رکھا

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

فہرست

دوسرے ایڈیشن کا پیش لفظ 8

پہلے ایڈیشن کا پیش گال 11

عبدکو 14

گل بی بی کا چاغی 19

وہ ہڈی اور گوشت میں کون تھا 22

لوہا فولاد کیسے بنتا ہے 28

ابتدائی تعلیم 32

استاذاں ہنر کاریں ناں

مٹھا خان مری 36

ہاشم خان غلزئی 44

غوث بخش بزنجو 47

صاحبزہ ادریس 53

کاکا جی صنوبر حسین 58

تعلیم یافتہ کاشش وپنج 72

لٹ خانہ تحریک 77

فی الحال سٹیشنری مارٹ 81

بلوچی زبان وادبءِ دیوان 87

رومانٹک کمیونسٹ 90

صحافت 92

سبزی کی ریڑھی لگاتا ہے 101

طلوع 102

ماما، ٹیچر بن گیا 103

پھر جھلک سیاست کی 105

یونیورسٹی، کامیابیاں 108

افغان انقلاب 110

بلوچ کا عاشق 111

ٹریڈ یونین 112

خواتین 113

بیرونِ ملک سفر 114

خاندان

آزاد جمالدینی 116

بلوچستان سنڈے پارٹی 124

اولاد 126

تالیف وتصانیف 133

سرداری قبائلی نظام کا سیاسی منظر 136

مُرگِ مینا 139

ماما بلوچی فوک شاعری چُنتے ہیں 141

ہمارا بلوچستان 143

شخصیات پہ مضامین 145

کتابوں پر تبصرے 152

متفرق مضامین 163

تراجم 168

ناپسندیدہ باتیں 170

لٹ خانہ 172

شمعِ فروزاں 174

طرزِ تحریر 178

شخصیت 182

جو سنگت بیلیوں نے کہا تھا 199

بشر کی گردن، اور موت کا چنگل 214

ضمیمہ جات

ضمیمہ 1 220

ضمیمہ 2 225

دوسرے ایڈیشن کا پیش لفظ

سرد آہ، کہ جسمانی عبداللہ جان بھی ''ہے'' سے ''تھا'' ہوگیا ۔ میں گُنگ ہوں، اس نا قابلِ تنسیخ جدائی کو بیان نہیں کر پاؤں گا ۔مگر کیا یہ بذاتِ خود ٹریجڈی نہیں ہے کہ بین الاقوامی ''ادب'' کا نوے فیصد حصہ جدائی کی ایسی ہی فریادوں، نالوں پر مشتمل ہے ۔

میں اِس وجہ سے بھی گنگ ہوں کہ مجھے فریم کے حدود سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے ۔فرد کی تمام تر اہمیت کے باوجود ہم اُسے اجتماع سے، کُل سے، کارواں سے اور سب سے بڑھ کر معروض سے الگ نہیں دیکھتے ۔بس اے پڑھنے والے! آپ خود کو اپنی نرم دلی کی انتہا کی حالت میں لائیں اور اپنے ایک قریب ترین دوست واستاد کی دائمی جدائی کا تصور کرلیں، میرے دل کی ترجمانی ہوجائے گی ۔

ہڈیوں اور گوشت پوست کے بنے شخص کی بجائے اُس کی اصل ہستی کی بات کی جاتی رہے گی ۔اُس کی سوچ کی، اُس کے فکر کی ۔ دلچسپ ہے ناں کہ matter یعنی گوشت اور ہڈیوں کے دوام کی بہ نسبت انہی گوشت پوست اور ہڈیوں سے نکلے دوسرے matter یعنی فکر کی عمر اور اس کا دوام زیادہ دیرپا ہے ۔

میرے لیے مسئلہ یہ ہے کہ چالیس سال کی بے پناہ قربت کو چاہوں بھی تو چالیس ورقوں، صفحوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کسی غیر معمولی اور صفتوں بھرے انسان کو بیان کرتے کرتے آپ خود اُس میں ڈھل جاتے ہیں۔ مثلاً آپ مست کو لکھ رہے ہوں تو لکھتے لکھتے آپ کی ''آپ گیری'' مدھم و مبہم ہو جاتی ہے اور آپ مست نما ''چیز'' بن جاتے ہیں۔ یہی پرابلم عبداللہ جان کے ساتھ ہے۔ آپ اُس کے پرسن کو بیان کرنے کی کوشش میں خود آدھا عبداللہ جان بن جاتے ہیں۔ بڑی دیر لگتی ہے اوقات میں آنے میں، اور نتیجے میں بہت بلندی سے بہت نیچے اپنی اوقات میں آنے میں روح کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔

8 مئی 1922 کو پیدا ہونے والا ہمارا یہ زندہ و خوش مزاج اور چاک و چوبند مرکزِ ثقل، 6 مئی 1993 میں فالج کا شکار ہوا۔ اور 16 ستمبر 2016 کو اُس نے یہ جہان چھوڑ دیا۔

میں نے 2007 میں اس پر یہ کتاب لکھی تھی۔ ماما عبداللہ جان والی وہ کتاب ''عشاق کے قافلے'' کے سلسلے کی نویں جلد تھی۔ گذشتہ دس برسوں میں ''عشاق کے قافلے'' نامی کتابوں کی کچھ مزید جلدیں بن گئی ہیں۔ چنانچہ اب یہ جلد نمبر 25 ہوگئی ہے۔

پچھلی جلد میں اُس کے ساتھی بھی شامل تھے، جو کہ اب الگ الگ کتابوں کی شکل میں نمودار ہوگئے ہیں۔

پروفیسر جاوید اختر اور عابد میر کی معاونت کا شکریہ۔ وہ نہ ہوتے تو تحریر کی روانی سے لے کر مذکر مؤنث کی درستگی تک، اور الفاظ کی بہتر ترتیب سے لے کر فکر کی صحت مندی تک سب کچھ کی ''شرافت'' ظاہر ہو چکی ہوتی۔

نیز، اچھی شاعرہ، افسانہ نگار اور اچھی انسان محترمہ فرحت پروین کا شکریہ، جنہوں نے ماما عبداللہ جان جمالدینی سے اپنی عقیدت کے طہ طور اس کتاب کی اشاعت کے لیے چالیس ہزار روپے کی خطیر رقم کا مالی تعاون کیا ہے۔

ابھی ہمیں اپنے اس استاد کے بارے میں بہت کام کرنا ہے۔ اُس کی تحریریں جمع کرنی ہیں۔ اُس پر ملکی اور بین الاقوامی سکالروں نے جو ضخیم کام کیا، اُسے مرتب کر کے شائع کرنا ہے۔ نیز اُس کے تحریکی رفیقوں، اور انسانوں کے لیے اُن کی خدمات کے بارے میں مواد جمع کرنا ہے۔

اچھی امیدوں کے ساتھ۔

شاہ محمد مری

8 مئی 2017

پہلے ایڈیشن کا پیش گال

''عشاق کا قافلہ'' نامی کتابی سلسلے کی نویں جلد ہے۔ یہ روشن فکر عالمی قافلے کے اس حصے کا بیانیہ ہے جس کا تعلق بلوچستان سے ہے۔ اس جلد میں انقلابیوں کی وہ کھیپ شامل کی گئی جو پچھلی صدی کی پچاس کی دہائی کے اوائل سے شروع ہوئی تھی اور آج تک قائم ہے۔

انسانی فلاح کے جاری و ساری اس قافلے میں شامل ہر فرد اس کا راہرو بھی ہے اور میر بھی۔ نیز اس کارواں میں شامل ہر مسافر ایک نجی خاندانی زندگی کا مالک بھی ہے۔ ہم نے کوشش کی کہ اِن محسنانِ انسانیت کا شخصی حال بھی نظر انداز نہ ہو، اور کاروان کا عمومی سفر نامہ بھی بیان ہو۔ ایسا کرتے ہوئے واقعات میں تکرار کا آ جانا ایک قدرتی امر ہے۔ ہم نے اس سے بچنے کی بہت کوشش کی مگر ایسا ہوا ہے۔ اسے مصنف کی سہل پسندی کے بجائے مضمون کی مجبوری سمجھا جانا چاہیے۔

یہ کتاب معاشی، سیاسی، سماجی اور ادبی میدانوں میں جاری نصف صدی کے سفر کا احاطہ کرتی ہے۔ گو کہ میدان بلوچستان تھا مگر یہی تو وہ میدان تھا جو بین الاقوامی واقعات سے خوب متاثر رہا۔ اس سفر میں شامل لوگ مقامی ہوتے ہوئے بھی کبھی مقامیائے نہ جا سکے۔ عالم گیر فکر کبھی ڈبوں میں بند نہیں کی جا سکتی۔ اسی عہد میں سوشلزم کمال تک پہنچا اور ٹوٹا۔ اسی عہد میں سرمایہ داری سکتے کی حالت سے دوبارہ ہوش میں آئی۔ اور اسی عہد میں تغیر کے سمندر میں جوار بھاٹا بے چینی کے تمام

سابقہ ریکارڈ زتوڑ بیٹھا۔ ہمارا سماج اور ہمارے لوگ اس سارے وجد آور ہڑبونگ میں سے گزرے۔ ان سب واقعات کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔

میں اپنے ان اکابرین اور ہم عصر بزرگ سنگتوں میں فرق و امتیاز کا نہ سوچ سکتا ہوں اور نہ حامی ہوں۔ عبداللہ جان اس قافلے میں نمایاں صرف اس وجہ سے دکھائے گئے ہیں کہ وہ کارواں کے اپنے ساتھیوں کے دلوں میں محترم ترین و مقبول ترین ساتھی ہیں۔ وگرنہ میرے لیے تو سب میری آنکھیں ہیں اور میں نے زندگی بھر اپنی ان آنکھوں کی بھرپور خدمت و حفاظت کی ہے۔ انہیں اپنی شناخت بنایا ہے۔ ان سب کو سلام.....سرخ رنگ کا۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری

6 جولائی 2007

”میں اس کولوہار کا فن سکھا رہا ہوں ۔یتیم ہے ۔ایک بھی نوجوان بھٹی پر کام کرنے نہیں آتا۔جس کو دیکھو ڈاکٹر بننا چاہتا ہے، ماہر زراعت یا انجینئر ہونے کے خواب دیکھتا ہے لیکن ہم بوڑھے کوچ کر جائیں گے تو پھر کیا ہوگا۔کون مرمت کرے گا لوگوں کے جوتوں کی،کون پتلونیں بنائے گا،گھوڑوں کی نعلیں کون بنائے گا؟!“

- میخائل شولوخوف

عبدؔ کو

سائنس،فرد کو اہمیت دیتے ہوئے بھی مرشد سازی کے دریا کے آگے بند بناتے رہنے کا کام جاری رکھتی ہے۔اکیسویں صدی کے اوائل کی تیسری دنیا،تنظیم اور پارٹی جیسے لازمی اور بنیادی عوامی اداروں سے تقریباً محروم کردی گئی ہے۔اوراس پہ ایک ایسی جاگیردارانہ جمہوریت انڈیل دی گئی ہے جس میں پورا معاشرہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی آزادانہ منافع کاری کی باندی بن چکا ہے۔یہ دنیا اب پیسہ بٹورنے کے لیے گلا کاٹنے والے مقابلے کا میدان بن چکی ہے ۔ وار لارڈز، انتظامیہ،عدلیہ اور مقنّنہ مکمل طور پر بڑے وارلارڈ زکی چاکری اور قبضہ میں چلے گئے ہیں۔اورایک ایسا سیاہ پس منظر قائم ہوگیا ہے جہاں آس پاس اور خود بلوچستان کے اندر عمومی پسپائی،مایوسی، بدامنی،اجداد پرستی،بدہیئتی،مکر،کینہ،پستی،مستی،سُستی،بے شرفی،شکست خوردگی،ناامیدی،سنگین تنہائی،اورمردم آزاری کا پرچم سربلند ہے۔تقریباً سارے کے سارے دانش وراسی فضا کی آبیاری میں بقا دیکھ رہے ہیں۔سٹیٹس کو والی ایک ہی قوت کے دو حصے ہوکر آپس میں غرّانے کے جاری عمل میں عوامی قوتیں بھی شامل ہوچکی ہیں۔

سماج کے بنیادی داخلی تضادات پرمباحث موقوف ہوچکے ہیں۔بلوچستان میں زرعی اور چرواہی معیشت اوراس سے وابستہ اکثریتی آبادی نصاب بدر کیے جاچکے ہیں۔پوشاک بدل بدل کر

ضیائی فلسفہ کو دوام بخشا جا رہا ہے۔ بلوچستان کو صنعتی سمت پکڑنے کی آرزو اور کوششوں کو نظریہِ پاکستان، ملاّ ایکسپورٹنگ، خندقوں، چٹانوں، غل غپاڑے، اور دھندو کہر سے دو چار کر دیا گیا ہے۔ تمدنی مراکز اندھیارے کی عبرت گاہیں بنے ہوئے ہیں۔

اس پس منظر کے باوجود نوجوان نسل کو روشن فکری، آدم دوستی، عالمگیر محبت اور سماجی انصاف کا متبادل دکھانے کی امیدیں ختم ہوئیں، نہ کاوشیں۔ کہ یہ قافلہ مضمحل و منتشر تو ہے مکمل معدوم نہیں ہے۔ قافلے مدہم ہوتے ہیں، معدوم کبھی نہیں ہوتے۔ گوکہ اس قافلے کا حوصلہ بڑھانے، اسے ''شاباش، شاباش'' کہنے اور ہمت کرو آگے بڑھو، چلاّنے والا سی آر اسلم لاہور کو ویران کر گیا ہے، ژوب میں سلیازی کا بلند اولمپیائی لیمپ بھی گُل ہو چکا، کرم خان روڈ کا خدائیداد اپنی کلینک بند کر چکا مگر سریاب میں فیض آباد پہ طویل عمری کے نیم شل اعضا کے ساتھ ایک پرومیتھیئس ابھی مشعل تھامے موجود تھا، زندہ تھا، دم غنیمت تھا۔ یہ شخص ہماری تحریک کی غلطیوں بھرے دیروز، ازسرنو جائزوں اور صف بندیوں پہ مامور امروز، اور اس تحریک کی واضح سمتوں پہ وقار کے ساتھ چلنے والے فردا، کے بیچ ربط تھا۔ یہ ربط ہمیں بہت عزیز تھا کہ ہماری اپنی شناخت نصف صدی سے اِسی کارواں سے ہے..... بلوچستان میں اس ربط کے کارواں کا سربراہ عبداللہ جان جمالدینی تھا..... جو ابھی ستمبر 2016 کو انتقال کر گیا۔

ٹالسٹائی کے ناول ''وار اینڈ پیس'' کے سمجھنے میں بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس ناول میں کرداروں کی تعداد 500 ہے۔ بلکہ ہر ایک کردار کے نام کے تین تین چار چار حصے ہیں۔ ناول نگار کہیں ایک نام استعمال کر رہا ہوتا ہے تو کہیں دوسرا۔ یہی کنفیوژن اس ناول کو دو تین بار بڑھنے پہ مجبور کرتی ہے۔ جب میں نے یہ شکایت سی آر اسلم سے کی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ خود اس نے یہ ناول نو بار پڑھا، تبھی جا کر وہ اس سے مکمل طور محظوظ ہو سکا تھا۔ اُس کا انکشاف تھا کہ فیض صاحب کو یہ کتاب جیل میں تیرہ بار پڑھنی پڑی تھی۔ سی آر اسلم صاحب نے مجھے اس کا حل یہ بتایا کہ ناول کے سارے کیریکٹرز کے پورے ناموں کی ایک فہرست بناؤں اور ناول پڑھتے وقت سامنے رکھوں تا کہ نام کا جو بھی حصہ استعمال ہو، اسے پہچانا جا سکے۔

ہمارے ممدوح عبداللہ جان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ اُس کا نام والدین نے عبداللہ رکھا تھا۔ عبداللہ سے وہ عبداللہ جان ہوا اور پھر میر عبداللہ جان۔ اِس کے علاوہ بھی اس کے بہت سے نام ہیں۔ اس کا کا ایک نام ''میر صاحب'' ہے۔ یہ بلوچوں میں بڑائی، بزرگی اور احترام کی علامت ہوتا ہے۔ بے تکلف دوست اُسے صرف ''عبداللہ جان'' پکارتے ہیں۔ جب کہ کچھ لوگ ''جمالدینی صاحب'' کہتے ہیں۔

اُس کا ایک نام البتہ اور بھی ہے: ''ماما''۔ ہوا یوں کہ جب میں پنجاب یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویشن کر رہا تھا تو اُس سے خط و کتابت شروع ہوئی تھی۔ میں اُسے کبھی میر صاحب لکھتا، کبھی جمالدینی صاحب، کبھی پروفیسر صاحب اور کبھی کبھی پورا نام یعنی میر عبداللہ جمالدینی لکھتا۔ مگر وہ اپنے ہر خط کے آخر میں ''تئی ماما'' (تمہارا ماما) لکھتا۔

لفظ ''ماما'' بلوچوں میں بہت محترم گردانا جاتا ہے۔ یہاں ہر شناسا اور ناشناس بزرگ کو ''ماما'' کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو چھوٹے، اسی رشتے سے مخاطب کرتے ہیں۔ مجھے میر صاحب کے اس لفظ میں بے پناہ اپنائیت محسوس ہوئی، لہٰذا میں نے اسے اسی نام سے مخاطب کرنا شروع کر دیا..... ''ماما''۔ جو مقبول ہوتے ہوتے آٹھ دس سال کے اندر اتنا عام ہوا کہ پھر یہ ہر شخص کی زبان پر چڑھ گیا۔ حتیٰ کہ اس کے ہم عمر بھی ہم سے اس کی طبیعت پوچھتے ہوئے کہتے ہیں: ''ماما کا کیا حال ہے؟''

گوکہ اس کے پاس نئے آنے والے لوگ اس کی خدمات، بڑائی اور بزرگ سنی دیکھ کر اسے ''بابا'' بھی پکارتے، مگر کچھ ہی دنوں بعد وہ بھی ''ماما'' بولنے لگتے۔ بلوچستان میں ''بابا'' تو صرف میر غوث بخش بزنجو کے لیے مخصوص ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح لفظ ''بابو'' صرف عبدالکریم شورش کی پہچان ہے۔

ماما کی والدہ صاحبہ لفظ عبداللہ کو بہت زیادہ میٹھا بنا کر ''عبدَکو'' کہتی تھی۔ اور جب ممتا کا پیار مزید جوش مارتا تو وہ اسے عبدَکو سے ''عبدَکو جان'' کہنے لگتی۔ اس کے تایا، خان بہادر شکر خان کے تئیں وہ ہمیشہ ''بزگرئے زھگ'' (کسان کے بیٹے) رہا۔ وہ اسے دور سے بلا کر کہتا:

''بزگرئے زھگ ! بگّوئے بہ جن من تراشاہی (1) اے دیاں'' (کسان کے بیٹے ایک بگو (2) (گلے کو آلہ موسیقی بنا کر دُھن پیدا کرنا)، گاؤ میں تمہیں ایک دونی دوں گا)۔

اور جب ماما بگّو (بغو) گاتا اور دونّی وصول کرتا تو ساتھ بیٹھے ہوئے اس کا والد اسے سخت ملامت کرتا کہ: ''پیسہ لے کر گاتے ہو!!''۔

بلوچوں میں رشتوں کا نام لے کر نہیں پکارا جاتا بلکہ ہم رشتے کے احترام میں دیا گیا لفظ بولتے ہیں۔ مثلاً والد کو ''ابّا''، والدہ کو ''آئی'' وغیرہ کہا جاتا ہے۔ مگر نوشکی والے ایسا نہیں کرتے۔ مثلاً اگر والد کھیتوں پہ گیا ہو تو ہم باقی سارے بلوچ کہیں گے، ''ابا کھیتوں پہ گیا ہے''۔ مگر نوشکی والے بلوچ انگریزوں کی طرح ڈائریکٹ Father استعمال کرتے ہیں۔ ''پث آ فے لوٹی'' (باپ پانی مانگتا ہے)۔ یعنی ''ابّا'' پانی مانگتا ہے کے بجائے ''باپ'' پانی مانگتا ہے۔ لہٰذا ماما کی اولاد اُسے ''پث'' ہی بولتی ہے۔ نوشکی اور اس سے ملحقہ افغانستان اور ایران کے بلوچ علاقوں میں یہی دستور مروج ہے۔

نوشکی کے بلوچوں میں ایک اور خاصیت بھی ایسی ہے جو دیگر بلوچوں میں موجود نہیں ہے۔ وہ لوگ اپنی پیاری شخصیت کے نام کے بعد لفظ ''جان'' لگا دیتے ہیں۔ اور وہ یہ لاحقہ بلا امتیازِ صنف اور عمر کے استعمال کرتے ہیں۔ یہ لفظ وقار کے اظہار کا ذریعہ بھی ہوتا ہے اور بے پناہ اپنائیت کا مظہر بھی۔ عبداللہ کے ساتھ ''جان'' اسی لیے تو لگاتے ہیں۔ نوشکی کے بلوچ حتیٰ کہ ''خدا'' کے لیے بھی ''خدا جان'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ خدا سے اس قدر پیار اور اپنائیت میں نے کسی اور زبان میں نہیں دیکھی۔ مکران کے لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ مگر وہ ''جان'' نہیں ''واجہ'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ وہ لوگ نام کے بعد ''واجہ'' لگانے کے بجائے نام سے پہلے ''واجہ'' لگاتے ہیں۔ وہاں ''جناب'' کے لیے مستعمل لفظ ''واجہ'' خدا کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں: واجہ خدا (جنابِ خدا)۔

البتہ مشرقی بلوچی میں ''واڑہ'' صرف سردار کے لیے استعمال ہوتا ہے اور وہ بھی بہت ہی غلامانہ ذہنیت کے لوگوں کی طرف سے۔ وہاں واڑہ ''آقا'' کے معنوں میں لیا جاتا ہے جو صرف

دوسرے درجے کے شہری استعمال کرتے ہیں۔ کسی انسان کے لیے ''واڑہ'' کا استعمال فیوڈلزم سے پہلے کے سماج میں قطعاً نہیں ہوتا۔

ماما کی رفیقۂ حیات بلوچی روایات کے مطابق اُسے نام لے کر نہیں پکارتی تھی، اور نہ ہی اپنی طرف سے دیے گئے پیار کے کسی اور نام سے پکارتی تھی۔ بلکہ وہ ساری بلوچ بیویوں کی طرح اپنے خاوند کو اپنی اولاد میں سب سے بڑی اولاد کے باپ کے بطور پکارتی تھی۔ مامی، ماما کو ''نور جہانئے پث'' (نور جہاں کے ابا) کے نام سے مخاطب کرتی تھی۔ نور جہاں ماما کی سب سے بڑی اولاد ہے۔

حواشی

1۔ ''شاہی'' اُس زمانے میں کرنسی کا ایک چھوٹا یونٹ ہوا کرتا تھا۔ شاہی، لفظ شاہ سے منسوب تھا یعنی یہ سکّہ بادشاہ کی حاکمیت کی علامت تھا۔ اس طرح یہ گویا شہنشاہیت کے زمانے کا سکہ ہوا کرتا تھا۔ خوانین قلات بھی ایسی کرنسی چلاتے تھے۔ جس کا نام ''کرم شاہی'' تھا۔

2۔ بگّو یا بغو، ہم چرواہی معیشت والوں کی من پسند موسیقی ہے۔ یہ ایک بہت ہی خوشگوار موسیقی ہوتی ہے۔ اس میں موسیقی کے کسی بھی آلے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ گلے سے مترنم لَے نکالی جاتی ہے اور گلے پر انگلی سے ہم آہنگ ٹھونکے یوں مارے جاتے ہیں جیسے آپ بانسری کی سوراخوں پر انگلیاں رکھ رکھ کر اور ہٹا ہٹا کر موسیقیت پیدا کرتے ہیں۔

گل بی بی کا چاغی

میر عبداللہ جان ضلع چاغی کا باسی۔۔۔۔وہی چاغی جہاں نواز شریف نے ایٹمی دھماکہ کیا تھا اور پاکستان میں سائنس کے چوٹی کے ٹھیکیداروں سائنس دانوں نے تکبیر کا نعرہ لگایا تھا۔۔۔۔۔ عبدالقدیر سے لے کر سمر مند تک۔وہی چاغی جہاں کے سائیندک (سیاہیں دک) نامی علاقے میں سونے، چاندی اور لوہے کے ذخائر کی موجودگی نے بلوچستان کو سامراجی قوتوں کے لیے مالِ غنیمت بنا ڈالا اور ''کمپنیوں'' نے بھوکے بائولے وحشیوں کی طرح اِس وطن کا رخ کیا۔وہی چاغی جس کی تاریخ میں بہت ہی طویل اور توانا سامراج دشمن اقدار کی حکمرانی ہے، جو جانا جاتا ہے اُس عظیم جنگ جو اور کمانڈر خاتون گل بی بی کے نامِ نامی سے جس نے پدرسری بلوچ معاشرے میں، انگریز دشمن لڑائی کی قیادت کی تھی۔

یاد رہے کہ پہلی عالمی جنگ کے دوران 1916 میں جنرل ڈائر کو اس علاقے میں جاری بلوچ مزاحمت کو کچلنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔اس نے آٹھ ماہ تک یہاں اپنی سازشوں، بدعہدیوں، دھوکوں، اور لالچوں کا بازار گرم کیے رکھا۔اس کے مدِ مقابل قول وقرار کے پابند، راست باز، اور آزادی پسند بہادر بلوچ تھے۔جو اپنے گھر میں عام سی انسانی باشرف زندگانی گزار رہے تھے۔بغیر کسی اشتعال کے اُن پر قبضہ کیا گیا۔ظاہر ہے کہ بلوچ اس قبضہ گر کے خلاف لڑے۔کمانڈر محترمہ گل

بی بی تھی جس نے اس سامراج دشمن جدوجہد میں حصہ لیا، اس کو منظّم کیا، اس کی قیادت کی اور اسے اس طریقے سے جاری رکھا کہ انگریزی افواج کے سربراہ جنرل ڈائر کو اس خاتون کو باقاعدہ سلیوٹ کرنا پڑا.....وہ جرات، بہادری اور ملٹری لیڈرشپ میں یکتا تھی۔

عبداللہ جان جمالدینی خود بھی اس عظیم خاتون سے بہت متاثر تھا، جسے اُس نے اُس وقت دیکھا تھا جب وہ اُس کے چچا فقیر جان سے ملنے آئی تھی۔ماما کے بقول وہ نسبتاً فربہ خاتون تھی جس نے سینے پہ دو رویہ کارتوسوں بھرا پٹہ سجا رکھا تھا اور اس کے کندھے پہ بندوق تھی۔جمالدینی صاحب کی معلومات کے مطابق اور بھی کئی خواتین نے جنگ آزادی لڑی تھی (جن کے نام کی ڈاک ٹکٹیں کبھی نہ بنیں)، مگر گل بی بی ان میں بہادر ترین اور ذہین ترین کمانڈر تھی۔وہ بے پناہ مذاکراتی مہارت رکھتی تھی۔جمالدینی صاحب انگریز کے خلاف مغربی بلوچستان کے بلوچوں کی اس جنگِ آزادی سے اس قدر متاثر تھا کہ اس نے اپنے ایک بیٹے کا نام اسی جنگ کے ایک ہیرو، جیئند خان کے نام پہ رکھا۔جیئند خان انگریزوں کا قسم کھایا ہوا دشمن تھا۔وہ بہادری میں لاجواب، عقل وتدبر میں لاثانی، قوتِ فیصلہ کا بادشاہ اور عزت واحترام کا مالک تھا۔اس جنگ کے دیگر ہیروؤں میں خلیل خان اور شاہسوار شامل تھے۔(1)

ایک بہت دلچسپ پس منظر ہے عبداللہ جان کے دیس اور اس دیس کے باسیوں کا۔ انگریز کے بقول:

''یہ لوگ چھوٹی موٹی لڑائیاں بہت اچھی طرح سے لڑتے ہیں اور اگر اُن کی صحیح راہنمائی کی جائے تو یہ ہر لڑائی بڑی بہادری سے لڑیں گے''۔(2)

ضلع چاغی بلوچستان کے بقیہ اضلاع کی طرح بہت وسیع علاقہ ہے۔اس کی آبادی بہت کم اور بکھری ہوئی ہے۔سو سال قبل تقریباً پوری کی پوری آبادی (آج جزوی طور پر) خانہ بدوش تھی لیکن کچھ آباد گاؤں بھی تھے جو ایک کچے قلعے یا کئی قلعوں اور چند کچے گھروں اور جھونپڑیوں پر مشتمل ہوا کرتے تھے۔اس علاقے کے بلوچ اس زمانے میں (اور آج بھی) ''گدان'' نامی کالے خیموں میں رہتے تھے۔چراگاہ کی تلاش میں ہمہ وقت نقل مکانی کی حالت میں رہتے تھے۔اسی لیے انہیں

ایک جگہ ٹک کے رہنا نصیب نہ تھا۔ان کے خیمے دھرتی کے سینے پہ کم اور اونٹ کی پشت پر زیادہ رہتے تھے۔ان کی عورتیں بھی اپنے مردوں ہی کی طرح مشکلات میں پلی ہوتی تھیں۔تقسیمِ کار واضح نہ ہونے کے سبب زیادہ کام عورتوں ہی کو کرنا پڑتا تھا۔اور وہ موسموں کی شدت، علاقے کی دشوار گزاری اور زندگی کی سختیوں کو بڑی ہمت اور استقلال سے جھیلتی تھیں۔

میر عبداللہ جان جمالدینی کے علاقے اور ایرانی بلوچستان کے درمیان کوئی قابلِ عمل حد بندی نہ تھی۔ نہ اُس وقت کے لوگ کوئی سرحدی لائن مانتے تھے۔سارے کا سارا ایک ہی بلوچستان ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے کا چاغی ضلع، مغربی بلوچستان یا سرحدی بلوچستان کہلاتا تھا۔بارانی زمینوں والے اس ضلع میں آمدنی کے ذرائع بہت محدود تھے۔لہٰذا اس علاقے کے قبائل لوٹ مار پر گزارہ کرتے تھے۔وہ ایران کے اندر دور دراز شہروں میں جا کر حملے کرتے تھے، وہاں سے جواہرات، سامانِ خورد ونوش اور مال مویشیوں کے گلوں کو لوٹ لیتے تھے۔حتیٰ کہ وہ لوگ عورتوں اور بچوں کو بھی اٹھا لاتے تھے۔

چاغی کے لوگ جو عورتیں مالِ غنیمت کے بطور لاتے تھے، وہ فارسی بولنے والی ہوتیں تھیں۔انہیں حقیر کنیزوں کی حیثیت سے قبائل میں خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ان کنیزوں کی قیمت ان کی صفات، عمر اور شکل وصورت کے مطابق مقرر کی جاتی۔

ماما عبداللہ جان ایسی درجنوں عورتوں اور ان کی اولاد کو جانتا تھا جنہیں ماضی میں قبائل، لوٹ مار میں ایران کے دور دراز علاقوں سے لائے تھے۔

حوالہ جات

1۔نصیر،گل خان۔ڈائر کی کتاب ''بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار'' کا پیش لفظ۔نسا ٹریڈرز کوئٹہ۔ صفحہ 15

2۔جنرل ڈائر/ گل خان نصیر۔بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار۔صفحہ 59

وہ ہڈی اور گوشت سے کون تھا؟

بلوچستان بلند وبالا پہاڑوں، بے آب وگیاہ صحرائی علاقوں، دشوار موسموں اور کم آبادی، والا خطہ ہے جہاں ایک نرم گرفتار، منکسر المزاج، اور بہت پیارا انسان رہتا تھا۔ جو ٹیچر تھا، رائٹر تھا، اور ریسرچ سکالر تھا۔۔۔عبداللہ جان، عبداللہ جان جمالدینی۔اگر آپ کو ایک آئیڈیل بلوچ دیکھنا ہوتا، اور اگر اُس کے لیے آپ اندرونِ بلوچستان نہیں جا سکتے تھے تو وہ شخص آپ کو کوئٹہ شہر میں ہی مل جاتا......سریاب روڈ پر، فیض آباد میں۔

جمالدینی بلوچوں کا ایک قبیلہ ہے جو کہ ''رخشانیوں'' کی ایک شاخ ہے۔گزیٹیئر کی یہ بات شاید صحیح نہیں ہے کہ رخشانی ایک شخص ''رخشان'' کی اولاد ہیں (1)۔دراصل یہ بہت بڑا قبیلہ بگٹیوں، مگسیوں اور بلیدیوں اور دیگر بڑے بڑے قبیلوں کی طرح اپنی ابتدائی جائے سکونت کے نام سے منسوب ہو گیا۔رخشانی قبیلہ ایک فرد سے نہیں بلکہ دریائے رخشاں سے منسوب ہے۔

اس قبیلے کی کئی بڑی ذیلی شاخیں ہیں، جن میں سے ایک جمالدینی ہے۔جمالدینیوں کا بانی جمال دین، یلان کا بھائی تھا۔وہ شمال میں ارغونوں کی حکمرانی کے زمانے میں خاران کا علاقہ چھوڑ کر چاغی آ گیا تھا۔ جمال دین کی نسل میں سے حسن خان نامی ایک نمایاں شخص ہو گزرا ہے جس کی اولاد میں شکر، بائی آن اور دادا کریم ہوئے۔ماما عبداللہ جان کے اجداد شکر خان کی آل اولاد میں

سے تھے۔ میر عبداللہ جان، جمالدینی قبیلے کے شکرزئی طائفے سے تعلق رکھتا تھا۔ جس کی اولاد کرم خان اور دادا کریم سے ہوتے ہوتے دوست محمد تک آتی ہے۔ ماما بتاتا تھا کہ اس کا دادا جہاں بیگ، اسی دوست محمد کا بیٹا تھا۔

عبداللہ جان کے پڑوسی قبائل میں مینگل، بادینی، یارمحمدزئی، گمشادزئی، اسماعیل زئی، ریکی، سنجرانی اور ساسولی قبائل شامل ہیں۔

اُس کے دادا کا نام جہاں بیگ تھا۔ وہ اپنے قبیلے، جمالدینی کا سردار تھا۔ سردار جہاں بیگ میر صاحب کی پیدائش سے کچھ عرصہ قبل 120 برس کی عمر پا کر فوت ہوگیا تھا۔ ماما کی دادی محترمہ بائناز (بہائے ناز) ساسولی قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔

ماما کے والد کے چچازاد بھائی، خان بہادر شکر خان ایک نامی گرامی شخص گزرا۔ وہ بہت زیرک اور دانا شخص تھا۔ اس نے اپنی مہمان نوازی، خیرخواہی، اور بہادری کی وجہ سے افغانستان، ایران اور برٹش بلوچستان میں بڑا نام پیدا کیا۔ ''خان بہادر'' کے لفظ سے ہی ظاہر ہے کہ اس نے انگریزوں کی خوب خدمت کی تھی۔ پورے سرحدی علاقے میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے تھے۔ نتیجتاً وہ حکومت برطانیہ کی نوازشات سے بھرپور انداز میں سرفراز ہوا۔ وہ سرحد سے متعلق تمام امور کا اعلیٰ پولیٹیکل عہدیدار تھا اور پوری طرح جنگجویانہ خصائل رکھنے کے باوجود فطرتاً بہت خیرخواہ آدمی تھا۔ ماما بتاتا تھا کہ خان بہادر نے ذاتی طور پر بلوچوں کو کبھی نقصان نہ پہنچایا۔ وہ ہر ایک کے کام آتا تھا۔ اس کا گھر حاجت مندوں کی دادرسی کا مرکز تھا۔ وہ سرکار سے اپنے بہتر تعلقات کو عام آدمی کے مفاد کے لیے استعمال کرتا تھا۔ سامراج دشمن، نورا مینگل کا ساتھ جب ساتھیوں نے چھوڑ دیا اور وہ تنہا رہ گیا تو اس نے شکر خان سے مدد چاہی۔ شکر خان نے بہت کوشش کی کہ سرکار سے اس کی مصالحت کروائیں۔ مگر انگریز، نورا مینگل سے اس قدر متنفر تھا کہ خان بہادر بھی اس کے لیے کچھ نہ کرسکا۔ لہٰذا اس نے نورا کو کچھ رقم دی، ایک بندوق دی اور اپنی بے بسی کا اظہار کرکے بخیریت رخصت کیا۔ یہی نورا بعد میں نواب خاران کے پاس چلا گیا تھا۔

عبداللہ جان کے والد کا نام خان جہان تھا۔ اُدھر مست توکلی کے یار، بہار خان کے

بزرگ کا نام جہاں خان تھا۔

خان جہان ہو یا جہاں خان۔۔۔ ہم تو دونوں کے شکرگزار ہیں کہ ایک نے دنیا کو عشاق کے سرپنچ توکلی مست سے آشنا کردیا اور دوسرے کی بدولت ہم بلوچستان کے حلیم رخ سے آشنا ہوئے ہیں۔

جمالدینی خان جہان، اپنے زمانے کا ممتاز اور روشن فکر شخص تھا۔ استہزا اور استرداد میں مسکرا دینے کی بات ہے، کہ خان جہان کے زمانے کا ملاّ بسم اللہ، سکول کی تعلیم کے سخت خلاف تھا۔ وہ اپنے گاؤں کے بچوں کو سکول جانے نہیں دیتا تھا۔ اسے جب بھی پتہ چلتا کہ کوئی بچہ سکول جارہا ہے تو وہ اس بچے کو سخت پیٹتا۔ اِدھر خان جہان کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ وہ خفیہ طور پر سکول جانے لگا۔ صبح سویرے چوری چھپے گھر سے نکل پڑتا اور تین میل دور، پیدل چل کر سکول پہنچتا۔ دن کو سکول پڑھتا اور دن ڈھلے چوری چوری گھر لوٹتا۔ اور گھر آکر چھوٹے بھائیوں کو پڑھاتا۔

عبداللہ جان کا والد خان جہان علاقے کی مؤثر شخصیت ہونے کے علاوہ قالینوں کا ایک باوقار تاجر اور ایک جہاں دیدہ شخص تھا۔ اس کا کاروبار افغانستان، ایران اور ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے والد کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پشاور ریلوے سٹیشن پر اس کی ملاقات سبھاش چندر بوس کے ساتھ ہوئی تھی۔ سبھاش بابو انگریزوں کے خلاف خفیہ آرمی کا کمانڈر تھا۔ یہ دیانت دار تاجر اپنے سفر و حضر اور وسیع دوستیوں کی وجہ سے بہت باشعور، وسیع القلب اور روشن فکر شخص بن گیا تھا۔ اس نے اسی روشن خیالی کے پیش نظر اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بہت توجہ دی۔ (2)

ماما کا تایا میر فقیر محمد فارسی اور اردو لکھ اور پڑھ سکتا تھا۔ فقیر جان 250 روپے ماہوار تنخواہ پر لیویز میں رسالدار کے عہدے پر فائز تھا۔ جب کہ ماما کا والد لیویز جمادار تھا۔ سوتگان نامی مقام پر ''مکران لیویز'' میں دونوں کی نوکری تھی۔ جہاں وہ اپنے کنبے کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ اسی لیے سوتگان سے ماما کے بچپن کی بہت ساری یادیں وابستہ رہیں۔

میر عبداللہ جان کی والدہ کا نام بی بی پری جان تھا۔ بی بی کا خاندان وسطی ایشیا سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ لوگ بخارا کے سید تھے۔ ان کا سیّد خاندان پہلے بخارا سے افغانستان آیا اور وہاں کنڑ نامی

علاقہ میں آباد ہوا۔ بعد ازاں وہاں سے نقل مکانی کر کے سیاہ کوہ کے علاقے میں آباد ہوا۔اس گھرانے کا تعلق نوشکی کے ایک نام ور قبیلے بادینی سے یوں بنا کہ انہوں نے ایک قبائلی جنگ میں بادینی قبیلہ کا ساتھ دیا۔ چنانچہ جنگ کے بعد قبائلی دستور کے مطابق بادینیوں نے انہیں اپنی زمین و جائیداد میں سے حصہ دیا، اور انہیں اپنے قبیلے کا حصہ تسلیم کرلیا۔

ماما کے نانا یعنی ،بی بی پری جان کے والد کا نام سید خواجہ احمد تھا۔ بلوچ معاشرے میں سیدوں کی یوں بھی بڑی عزت کی جاتی ہے۔مگر یہ شخص اپنی حلیم طبعی ، خیر خواہی اور نیک دلی کی وجہ سے بہت ہی ہر دل عزیز سید تھا۔خود محترمہ پری جان بھی بہت غریب پرور اور انسان دوست خاتون تھی۔سردار جاں بیگ کی بہو ہونے کے باوجود وہ انتہائی سادہ طبع شخصیت تھی، کوئی غرور، کوئی تکبر نہ تھا۔دولت اور جاہ و جلال پہ کوئی تفاخر ، کوئی کبر نہ تھا۔وہ ایک مذہبی خاتون تھی۔ مذہبی فرائض ادا کرنے والی گاؤں کی سیدھی سادی بلوچ خاتون۔ایک سید اور پڑھے لکھے گھرانے سے تعلق کی وجہ سے اُسے بنیادی مذہبی تعلیم بھی دی گئی تھی۔ وہ بلاتشہیر انسانوں کی مدد کیا کرتی تھی۔اس کی سادگی ، پرہیزگاری، خیر خواہی اور دوسروں کی مدد کرنے کی وجہ سے لوگ اسے ولی سمجھتے تھے۔

یہاں ماما عبداللہ جان کے ایک ماموں کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے۔اسے پتہ نہیں کہاں سے حافظؔ کا کلام پڑھنے کی لت پڑ گئی۔صبح شام اٹھتے بیٹھتے دیوانِ حافظ دہراتا رہتا۔مشہور تھا کہ حافظ کا مطالعہ انسان کو پاگل بنالیتا ہے۔سو وہ پاگل ہوگیا۔

رحمٰن بابا کے کلام کے بارے میں بھی یہی مشہور کر دیا گیا ہے اور اِس افواہ کو تقویت دینے کے لیے بہت سے قصے گھڑ لیے گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک عالم نے اس افواہ کو باطل قرار دینے کی ٹھان لی۔اس نے رحمان بابا کے دیوان کو رسی سے درخت پر لٹکایا اور دور کھڑے ہو کر اسے پتھر مارنے لگا کہ دیکھو لوگو! اِس کتاب میں کچھ نہیں، یہ کسی کو پاگل نہیں بنا سکتی۔

لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تم خود سوچو، جو کچھ کر رہے ہو یہی تو پاگل لوگ کرتے ہیں۔

الغرض ماما کا یہ ماموں مجنوں بنا۔اُس کا نام تھا عبداللہ۔ اُسی عبداللہ کا نام بعد میں بھانجے پر رکھا گیا۔حافظ شیرازی کا پاگل بنایا ہوا گھرانہ!!!

پری جان کے بڑے بیٹے اور عبداللہ جان کے بڑے بھائی کا نام بنگل خان تھا۔ (پیدائش 1912)۔یہی بنگل خان بعد میں عبدالواحد بنا اور اس کے بعد مشہور بلوچی شاعر عبدلواحد آزاتؔ ہو کر شہرت پائی۔ بلوچ دستور کے مطابق میاں بیوی ایک دوسرے کو نام سے نہیں پکارتے ہیں چنانچہ میر صاحب کی والدہ اپنے شوہر کو ''بنگل ئے پث'' (بنگل کا ابا) اور شوہر، بیوی کو ''بنگل ئے ماث'' (بنگل کی ماں) کہہ کر پکارتے تھے۔بنگل کے بعد ان کے ہاں ''ایں جان'' نامی بیٹی پیدا ہوئی۔ پھر ایک اور بیٹی عزت خاتون پیدا ہوئی مگر وہ کم سنی میں فوت ہوگئی۔اس کے بعد عبداللہ جان پیدا ہوا اور اس کے بعد دوسری بیٹی پیدا ہوئی۔اس کا نام بھی انہوں نے مرحومہ بیٹی کے نام پر عزت خاتون رکھا۔وہ بھی کم سنی ہی میں فوت ہوگئی۔

بی بی پری جان ایک اچھی انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت اچھی ماں بھی تھی۔ اس نیک اور پارسا خاتون نے عبداللہ جان کی پرورش انتہائی ذمہ داری کے ساتھ کی۔ وہ اسے نیکی، سچائی اور بھلائی پر مشتمل لوک کہانیاں سنایا کرتی تھی۔اسے اچھے کوہستانی آداب، خوب صورت بلوچ روایات، رواداری، عجز اور انسانی دوستی سکھاتی تھی۔ ماں نے عبداللہ جان کو قصص الانبیا کے سارے قصے سنا سنا کر بڑا کیا۔ بڑے انسانوں کی بڑی پرورش!!۔

حوالہ جات

5۔گزٹیئر آف بلوچستان۔ چاغی۔گوشہ ادب کوئٹہ۔صفحہ 30

6۔بریالی، عبدالکریم۔''محبت کے پیکر، انسان دوست واجہ''۔ماہنامہ سنگت کوئٹہ، اپریل 2005

لوہا کیسے فولاد بنتا ہے!

عبداللہ جان کے ہم عصر بلوچستان کے بارے میں، لوگوں کی دو آرا ہیں۔ ایک یہ ہے کہ یہ کٹے پھٹے کرخت پہاڑوں والا خطہ ہے۔ جہاں بے آب وگیاہ اور غیر دوستانہ صحرا ہیں۔ معاندانہ موسم ہیں۔ حشرات وحیوانات، وحشت اور خونخواری کا نمونہ ہیں۔ اور کم آبادی والے اس ڈراؤنے علاقے پر قحط، سیلابوں اور بھوک و پیاس کی موت کا راج ہے۔ اس رائے کے مطابق بلوچ سراپا غصہ ہیں، گالی گلوچ ہیں، چاقو خنجر ہیں، قتل ہیں۔ وہ نسلوں تک انتقام لیتے ہیں، اور...... برادر کش ہیں۔

بالائی طبقات کی آشیر باد والی اِس رائے کے مطابق ہم قبائلی اور جاگیرداری نظام کی زنجیروں میں رضا کارانہ جکڑے، ان پڑھ اور پسماندہ حیوان ہیں۔ یعنی ہم سب واپس 1550ء کے زمانے میں جانا چاہتے ہیں جہاں چاکری دربار ہو، بلوچی لشکر و سپاہ ہو، نڑ وسر، دھریس وچاپ ہو، چنگ و بھنگ ہو، بھیڑوں کی گھنٹیاں ہوں، گوہر جتنی کا حسن ہو، اور تلواروں سے کٹے اس کے شتر بچوں کی لاشیں ہوں۔ ہم گویا وہیں جانا چاہتے ہیں جہاں انٹرنیٹ نہ ہو، بجلی نہ ہو، جہاں ٹرانسپورٹ پیش وکھجور کا بنا ہوا جوتا ہو۔ جہاں علم وحلم، دروغ وراست، میرے تیرے کا فیصلہ تلوار کرتی ہو، جہاں سید کی منگیتر کو سردار چھین لیتا ہو اور سید جس کا لُٹ گیا بھنبھور اپنی شرمندگی کے

آنسوؤں پر تیرتا اس آئیڈیل سماج کو جوتے مارتا لنگڑوں، پاگلوں اور ملنگوں کا ساتھی بن جائے اور تیس برس تک دھاڑیں مارتا ہو(1):

چیڑ مکہ ئے چنڈ یثغا ں
گوں پُر گُنا ہیں چمبواں

گویا بلوچستان کے لوگ خان قلات کے ابدی ازلی حقیر قصیدہ خواں لشکری ہیں جس نے محض ٹیکس کا نصف حصہ ہتھیانے کے لیے بلوچ ملت کو تلوار سے دونیم کیا، آدھے کا نام زگری اور آدھے کا نمازی رکھا۔ اور اس طرح دونوں کو اپنی ظلِ سبحانیت میں داخل کرادیا(2)۔ ''اُن'' کی رائے میں ہم وہیں جانا چاہتے ہیں جہاں ''ہندو بلوچوں'' کے سر پہ بال رکھنے کی ممانعت تھی، جہاں صرف سردارانِ مکران کی بیبیاں ہی رنگین کپڑے پہن سکتی تھیں، جہاں سیاہکاری کے بارے میں لکھی گئی کتاب کا ٹائٹل بزورِ روایت وغیرت بدلوایا جائے(3)۔ ''اُن'' کی رائے ہے کہ ہم اُسی جامد وساکن وبے شعور سماج میں سڑنا گلنا چاہتے ہیں۔

دوسری رائے یہ ہے، کہ نہیں، بلوچستان تو نعمتِ خداوندی ہے۔ یہاں مردم خیز پہاڑ ہیں۔ یہ گڈ، گرانڈ، وشکی(4) اور کبوتر کی اٹھکیلیوں والی سرزمین ہے، یہاں کے جبل آہنگِ آدم کے حسین ترین بازگشت ہیں۔ بلوچستان کے صحرا، شہداد ومہناز، دوستین وشیریں، ہانی وشہ مرید اور مست وسمو کے رومانوی داستانوں کی جائے پیدائش ہیں۔ یہ شفیلی، چنگ، لیلڑی اور ڈیہی(5) کی تخلیق کا سبب عطا کرنے والی سرزمین ہے۔ یہ سُتکغیں ڈور، پیرک، نندودمب اور مہرگڑھ سولائزیشن کا مالک خطہ ہے، یہاں کا نعرہ: ''جواں نہ ینت جنگا نی بذیں بولی''(6) ہے۔ بلوچ درگفتار، دست ودست اور سراپا مہر ہیں، یہ لوگ جھنگ اور بھنبھور تک پیار کا لین دین کرتے ہیں، یہ برادر پال ہیں۔

عبداللہ جان اسی ثانی الذکر، رائے کا ساتھی تھا۔

اور خود عبداللہ جان؟ وہ تو مجسم بلوچ تھا۔ نرم گفتار محقق تھا، حلیم الطبع مفکر تھا، زندگی سے

بھرپور افسانہ نگار تھا، حق گو صحافی تھا، انسان دوست بزرگ تھا، ترقی پسند انسان تھا، سماجی انصاف کا راہ رو تھا، شریف النفس لٹ خانہ تھا، شفیق ومہربان استاد تھا، دھیما رہنما تھا، ہمارے وطن کا نرم چہرہ تھا۔

بلوچستان کی پیدائش کو چار ارب ساٹھ کروڑ برس ہو چکے ہیں جب کہ معاصر بلوچستان کی روح، یعنی عبداللہ جان کی پیدائش 8 مئی 1922 کی ہے۔ بلوچستان کی روح سچائی ہے۔ سادگی ہے،، شرافت ہے، عبداللہ جان ہے۔

میر صاحب کی پیدائش کی یہ تاریخ بلوچوں کی مقدس ترین مذہبی کتاب کے کسی صفحے پر اس کے مقدس ترین رشتہ دار یعنی والد نے ہجری کیلنڈر میں یوں لکھ دی تھی: ''تولد فرزندم عبداللہ جان بروز دوشنبہ 11 رمضان المبارک 1340 ہجری شد،(7)۔ اور بعد میں تقدیس بھرے بزرگ، محترم خلیل صدیقی نے اسے گریگورین کیلنڈر میں تبدیل کیا تھا۔ تقدیر تقدس بھری بالٹیاں کس کس طرح ایک شخص پہ انڈیلتی جاتی ہے! خلیل صدیقی تعلیم کے سلسلے میں بلوچستان بھر کا محسن تھا۔

جمالدینی، جمالدینیوں کے سردار گھرانے میں پیدا ہوا مگر اسی نوبل طبقے کا سب سے بڑا غدار بھی وہی نکلا۔ (بلوچستان میں بہت مکروہ استعمال ہوا ہے لفظ ''غدار'' کا، کتنی کثرت سے موت کا یہ وارنٹ جاری رہا بلوچستان میں، جسے صرف سرکارنے ہی بے دریغ استعمال نہ کیا بلکہ اس منحوس لفظ کو ہر وڈیرہ نے، ہر اختیاردار نے، اور ہر لیڈر نے اپنے مخالف رائے رکھنے والے پہ بے دریغ استعمال کیا! غدار مذہب کا، ملک کا، نظریہ پاکستان کا، بلوچ قوم کا غدار، انقلاب کا غدار، پارٹی کا .....)۔ عبداللہ جان اس لفظ سے مستثنیٰ نہ رہا۔ وہ سردارزادہ ہوکر بھی سرداری نظام کا غدار بن گیا۔

حوالہ جات وحواشی

1۔اشارہ ہے شہ مرید اور حانی کی عشقیہ داستان کی طرف جہاں سردار چاکر، سید گھرانے کے شہ مرید کی منگیتر ومحبوبہ ہانی کو اس سے چھین لیتا ہے۔اور بے بس شہ مرید فراق و بے عزتی کے آتشیں جذبات میں صحرانوردی کی زندگی جیتا ہے۔

میں نے مکہ کے جھالر جھنجھوڑے

اپنے پُر گناہ پنجوں سے

2۔اٹھارویں صدی کے خانِ قلات میر نصیر خان نوری۔

3۔سال 2005 میں بلوچ نوجوانوں نے ایک دانشور کی طرف سے سیاہکاری کے موضوع پر لکھی گئی کتاب کا ٹائٹل یہ کہہ کر بزورِ قوت تبدیل کروادیا کہ اس سے گویا بلوچ روایات کی توہین ہوتی ہے۔

4۔پہاڑی دنبی، پہاڑی دنبہ اور ہرن۔

5۔بانسری، چنگ، لیلڑی، ڈیہی۔یہ سب بلوچی فوک گیت اور موسیقی کے آلات ہیں۔

6۔مست کا مصرع: اچھی نہیں ہوتیں جنگوں کی کریہہ باتیں

7۔جمالدینی، عبداللہ جان ''زندگی نامک'' ماہتاک بلوچی زند۔نوشکی۔اگست 2001۔صفحہ 7

ابتدائی تعلیم

میر عبداللہ جان کے بچپن کے زمانے میں وسطی ایشیا کے تمام علاقوں کی طرح بلوچستان میں بھی شیخ سعدی کی ''پنج کتاب''، تدریس کی مقدم ومقبول کتاب ہوا کرتی تھی۔ماما عبداللہ جان کو بھی اُس کے سکول سے تعلیم یافتہ والد نے سب سے پہلے قاعدہ بغدادی، قرآن مجید اور پنج کتاب کی تعلیم دلادی۔میرے محترم قاری! کیا آپ، اپنے بچوں کو سعدی پڑھا رہے ہیں؟۔اگر نہیں، تو عبداللہ جان سے بڑی یاری کا دعویٰ نہ کیجیے کہ سعدی تو اس کا پیر ومرشد تھا۔صرف سعدی ہی کیوں؟۔وہ تو حافظ، فردوسی اور مولانا روم کا بھی عاشق تھا۔مست، شاہ لطیف، بلھے شاہ، وارث شاہ، خواجہ فرید اور رحمٰن بابا کی زبان کی نرمی، صفائی اور پاکی کا دلدادہ تھا۔ان سب عظیم شعرا کے دیوان آخر تک اس کے کتب خانے کی زینت رہے۔

پنج کتاب مکمل کرنے کے بعد وہ سوتیگان ماشکیل چلا گیا جہاں اس کے چچا فقیر جان نے اسے اردو اور ریاضی کی تعلیم دلادی۔جیسے کہ بتایا گیا ہے وہ وہاں لیویز کی نوکری کے سلسلے میں متعین تھا۔

اور پھر وہ دن آیا جب محترم خان جہان نے اپنے لختِ جگر کو سکول میں داخل کروادیا۔اپنی طرح چوری چھپے نہیں بلکہ علی الاعلان، بارات کی صورت میں لے جا کر بیٹے کو نوشکی پرائمری

سکول میں داخل کرادیا۔ سال ہے 1932۔ ملاّ گم اور خان جہان کا بیٹا موجود.....

''روشنیوں کی راہ میں جو دیوار بنے گا.....نہیں رہے گا!(1)

علم وعبداللہ جان کی یاری پھر ایسی پکی نکلی کہ اس کی موت تک مضبوطی کے ساتھ قائم ودائم رہی ۔ اورنوے برس کی عمر میں بھی اگر سردیوں کا سورج اپنی روشنی عطا کرنے میں کنجوسی کا مظاہرہ نہ کرتا تو آپ کو کوئٹہ کے مضافاتی علاقے فیض آباد میں 89 سالہ یہ بوڑھا صحن میں دھوپ سینکتے ہوئے اینگلز کی ''فطرت کی جدلیات'' یا کارل ساگان کی تصنیف ''کاسموس'' پڑھتا ہوا مل جاتا۔

میر عبداللہ جان پیدل سکول آیا جایا کرتا تھا۔ سکول کے زمانے کا اس کا بہترین دوست ایک ہندو لڑکا 'جَے چند تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا دوسرا بہترین دوست سکینہ نامی اُس غلام عورت کا غلام بیٹا شہاب الدین تھا جسے نوشکی کے بلوچ ایران پر حملہ کر کے غنیمت کے بطور پکڑ کر لائے تھے۔ فطرت نے بچپن ہی سے عبداللہ جان کو مظلوموں، کم زوروں اور ان کے کاز کے ساتھ جڑے رہنے کے انتظامات کر رکھے تھے۔

یہ تو ہم بتا ہی چکے ہیں، کہ وہ چھ سال کا تھا جب والد نے اسے سوتگان بلا لیا۔ وہ لیویز جمادار تھا وہاں ۔ ماما کی ابتدائی تعلیم وہیں سے شروع ہوئی ۔ سرپرستی اس کے چچا فقیر جان نے کی۔ 1927 میں یہیں پر اس نے پہلی بار جہاز دیکھا، دوربین دیکھی۔ یہیں اسے افغانستان کے امیر امان اللہ خان کے بارے میں معلوم ہوا۔ بڑی بڑی شخصیات سے اس کی ملاقاتیں بھی یہیں ہوئیں جن میں محترمہ گل بی بی شامل تھیں ۔ یہیں اس نے پہلی بار انگریز افسروں کے لیے آئے ہوئے بھنگی ''سباہ'' کو دیکھا جو کہ نینی تال کا رہنے والا تھا۔ ماما کو بڑی حیرت ہوئی کہ لوگ اُسے بھی جمادار کہتے تھے اور اس کے اپنے والد کو بھی ۔ بعد میں پتہ چلا کہ لیویز جمادار ایک افسرانہ عہدے کا نام ہے۔

سباہ گانجا پیتا تھا، ماما کھڑا یہ سب دیکھتا تھا۔ بچے کو بھنگی کے کریہہ کام کو دیکھ کر اس سے بڑی ہم دردی ہوگئی۔ اس سب کچھ نے مستقبل کے دانش ور پر زبردست انداز میں اثر پذیر ہونا تھا۔

بعد میں جب وہ کوئٹہ گیا تو جس مکان میں رہتے تھے وہ ایک قندہاری شیعہ شہاب الدین کا تھا۔ ماما بھی عاشور کے دنوں میں علم اٹھانے میں اس کی مدد کیا کرتا تھا۔ جے چند، سباہ، اور شہاب الدین کے ساتھ ہمدردی اور رفاقت، اور علَم برداری مل کر ایک شخص کو کتنا اعتدال پسند، روادار اور سیکولر بناتے ہیں، عبداللہ جان اس کا ثبوت تھا۔

حوالہ

1۔ حبیب جالب کا ایک مصرع

استاذاں ہنرکاریں ناں

میر مٹھا خان مری

(1912.....15اپریل1988)

''شاعروں اور ادیبوں نے قدیم زمانوں سے انسانی روح کو گرفتار کرنے کے لیے ایک جال بچھا رکھا ہے۔ اگر ہم انسانی روح کو اس جال میں پھانس نہ سکیں تو ہمیں یہ بات ماننی پڑے گی کہ یا تو ہمارا جال پھٹا ہوا ہے یا پھر ہم جال بچھانا ہی نہیں جانتے''۔.....**گورکی**

جن لوگوں کو فطرت نے کچھ بنانا ہوتا ہے، ان کے لیے وہ رفیق و تالیق چُن چُن کے مقرر کرتی ہے۔ اور عبداللہ جان جمالدینی و خیر بخش مری کا استاد کون بنتا ہے؟، علاّمہ میر مٹھا خان مری۔ ہماری دھرتی کا بہت بڑا دانش ور۔ پُر خلوص مٹھا خان، نیک نیت مٹھا خان، محبتِ علم و دانش میں سرشار مٹھا خان۔ وہ شاعری بھی کرتا تھا اور ''خضرؔ'' تخلص رکھتا تھا۔ وہ حافظؔ کا حافظ تھا، اقبالؔ کا، مستؔ کا، سعدیؔ کا، فردوسی و خیام کا، اور غالب و عطار کا حافظ تھا۔ ایسے مہربان و شفیق مفکر اور ہمہ وقتی استاد کے پاس تو بلھے کو بھی لے جائیں تو وہ بھی ایک ہی ہشت پہر میں گانے لگے:

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

میر مٹھا خان 1912 میں کاہان میں پیدا ہوا، جب ابھی ابھی اُس کا قبیلہ نفسک و ساڑتاف کی انگریز دشمن لڑائی سے باہر آیا تھا۔ مگر ہڑب و گمبد کی جنگیں ابھی چھ سال بعد جمنی تھیں۔

مست کے وصال کو چودہ برس گزر چکے تھے۔ سرداری مہراللہ خان کی تھی۔

میر مٹھا خان کے والد کا نام میر گلو خان تھا۔ وہ مری میں باولہاں زئی شاخ سے تعلق رکھتا تھا جو کہ دستار یعنی سرداری خاندان ہے۔ مقامی مدرسہ میں گلستانِ سعدی اور بوستان پڑھے اور وہیں پہ مولانا روم پڑھا۔ ابتدائی سکولی تعلیم وہیں اپنے کاہان میں حاصل کی۔ بعد میں حالات کی مجبوری کی بنا پر اس نے بقیہ تعلیم پرائیویٹ طور پر حاصل کی۔ 1936 میں منشی فاضل پشاور یونیورسٹی سے کیا۔

میر مٹھا خان نے 1928 سے لے کر 1936 تک سکول ٹیچری کی۔ اسی زمانے میں وہ میر عبداللہ جان کا استاد بنا۔ اسی طرح سردار خیر بخش مری اُس کا ذکر اپنے ''محترم استاذ'' کے بطور بہت عزت سے کرتا تھا۔

میر مٹھا خان مری، میر عبداللہ جان کو پرائمری میں اردو اور حساب پڑھاتا تھا۔ عبداللہ جان 1934 میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ صرف مٹھا خان ہی نہیں بلکہ اسی سکول کا ہیڈ ماسٹر بلوچستان کی ایک اور بلند علمی شخصیت جناب محمد ہاشم غلزئی تھا۔ یہیں اسی سکول میں عبداللہ جان اور اس کے عم زاد بھائی بلال خان صبح سکول کی اسمبلی میں دعا پڑھتے تھے۔ اس لیے کہ ان دونوں کی آواز اچھی تھی۔ پھر جب سکول کی سالانہ تقریبات کی تیاریاں شروع ہوئیں تو یہ دونوں لڑکے میر مٹھا خان کے حوالے کر دیے گئے۔

مٹھا خان نے علامہ اقبال کی کتاب ''زبورِ عجم'' انھیں تھما دی اور ایک غزل یاد کرنے کو کہا۔ وہ غزل یوں ہے:

گشادہ روز خوش و ناخوشِ زمانہ گزر
زگلشن و قفس و دام و آشیانہ گزر

گرفتم این کہ غریبی و رہ شناس نہ ای
بکوئے دوست بہ انداز محرمانہ گزر

بہر نفس کہ برآری جہاں دگرگوں کن
دریں رباط کہن صورتِ زمانہ گزر

اگر عنانِ تو جبریل و حوری گیرند
کرشمہ بر دِلشان ریز و دلبرانہ گزر

اس قدر خوب صورت اور سبق آموز باتیں بتانے والے استاد ہوں تو تقریب میں تو داد پانی ہی ہوتی ہے، اور مستقبل میں بچے کی زندگی، سمت یافتہ بن ہی جاتی ہے۔ میر مٹھا خان نے ایک لحاظ سے عبداللہ جان بشمول اپنے دیگر تمام شاگردوں کی زندگی انسان دوست راہ پہ متعین کر دی۔ مٹھا خان زندہ ہوتا تو اُس سے پوچھا جا سکتا تھا کہ:

اے بزرگ، اے حکیم، ذرا مولانا روم کے شعر میں بتائیے کہ آج آپ کے شاگردوں کو بلوچستان کا چہرہ قرار دے کر دراصل ہم کس کی تعریف کر رہے ہیں؟۔ آپ کی ناں!!۔ تو اور ہم تعریف کریں بھی کس کی؟۔ کسی ایسے کی جو خان جہانوں کے بیٹوں پر علم کے دروازے بند کر دیے؟ ان پہ خوف و بھوک، بے حرمتی، جبر و استحصال مسلط رکھے؟، سماج کی ارتقا پذیر گردن کو دبوچنے کے لیے مناسب حالات پیدا کیے؟ یا کسی ایسے طالع آزما کی جو کہتا ہو: ''جمہوریت، پاکستان کے عوام کے مزاج کے مطابق نہیں ہے؟''۔ ان کی تعریف وہی کریں جن کے مقدر میں یہ منحوس فریضہ لکھا گیا ہے۔ ہم تو آپ کے توکلی کی تعریفیں کریں گے، ہم تو آپ کی تدریس والے پیشے کے دھیمے پن اور استقلال کی توصیف کریں گے، ہم تو بلوچستان اور اس کے چہرے کے گیت گائیں گے .....ہم تو آپ کے شاگردوں کی تعریف کریں گے۔

میر مٹھا خان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اپنے شاگردوں کی علامہ اقبال سے دوستی کرا دی۔ اقبال جو اُس کے سارے شاگردوں کے انسپریشن کا سرچشمہ ہے۔ اقبال ہی نے انہیں عوام دوست بنایا، انہیں تفکر کی عادت بخشی۔

میر مٹھا خان اقبال کا عاشق تھا۔ اس نے بلوچی میں اس پر کتاب لکھی: ''دُرگالِ اقبال''۔

یہ کتاب اقبال پر کسی بھی زبان میں لکھی گئی اب تک کی بہترین کتابوں میں تصور کی جاتی ہے۔ توکلی مست اور رحم علی مری کو دنیا کے سامنے سب سے پہلے میر مٹھا خان نے روشناس کرایا۔اسی نے پہلے ''توکلی مست'' نامی کتاب بلوچی میں لکھی؛ پھر ''سمو بیلی مست'' اردو میں تحریر کی۔

میر مٹھا خان کی تحریر بہت رواں اور رنگین تھی۔اس کے علاوہ جام دُرک، رحم علی مری، درگال اقبال، بلوچی لغات، بلوچی اردو ڈکشنری اور سیرت النبیؐ (بلوچی) لکھی۔میر مٹھا خان بلوچی کی دو ڈکشنریوں کا مصنف بھی تھا۔میر صاحب نے ملاّ فاضل پر بھی کام کیا۔میر عبداللہ جان کی یہ بات سو فیصد درست ہے کہ ''میر مٹھا خان مری بلوچی کا سب سے بڑا نثر نگار تھا''۔

میر مٹھا خان ایک نہایت شستہ، شائستہ اور دل موہ لینے والا شخص تھا۔وہ دھیمے انداز میں گفتگو کرتا تھا۔خوش گفتار شخص جو فہم و شعور سے مخاطب کو سیراب کرتا جاتا۔وہ چوں نکہ حافظ و رومی و عطار و اقبال و سعدی و خیام و ثنائی و غالب و جام درک کا حافظ تھا لہٰذا شعر کی شعریت اور موسیقی کی موسیقیت کا زبردست جانکار تھا۔خضؔر خود بہت اچھا ہارمونیم بجاتا تھا۔

منشی فاضل کی سند کا مالک میر صاحب کچھ زیادہ عرصہ نوشکی میں نہ رہا۔جلد ہی اس کا تبادلہ ہوگیا۔بعد میں تو اس نے درس و تدریس کا پیشہ ترک ہی کر دیا۔

میر صاحب ٹیچری کے بعد منسٹری آف اسٹیبلشمنٹ میں رہا۔(1)۔مگر اس کے خیالات اس کو زیادہ عرصہ نوکری کرنے نہ دیتے تھے۔وہ بلوچ قوم کا ہم درد اور نظریاتی استاد تھا:

رسی داں مزلا مئے نرم گا میں کارواں روشے
سرہ بیث ماہ و استاراں، وث گندی جہاں روشے
منی رنجاں دِہ نز آڑ تو برغاں گوں وثی گنجاں
ہمے سوذا نواں کہ گراں کفی سوذا گراں روشے
تہار شونیں جڑاں سر ساکشہ تیغی جہاں مرشی
اناگاہ درکفی روش اژہمے دنز و مژاں روشے
مروشی اے ڈغار تئ ایں پصل تئ ایں کشار تئ ایں

اغر ہیری دمے بیثہ کنوں ما لیکواں روشے
پچے چم حانلانی گلگل انت دانی دِہ گوں انژساں
مناں یکّو، دل اَیں، پولا گراں ژہ چاکراں روشے
منی ماہیں اُمل ہر ہیل آخر کئے منی پولا
مناں پکیں کہ کئے روشے، خذا سئ ایں کہ تاں روشے
زہیر سا سارغا نیلاں رواں گنداں وثی دوستا
روانو، ہازغیں ٹپاں وثی درماں کناں روشے
منی امبل مروشی چے آ پُڑسئے تہ منی حالا
وثی ڈکھانی سرحالاں کناں گوں تو بیاں روشے

اُس کی بلوچی شاعری کا ایک اور ٹکڑا ملاحظہ ہو:

تہار شومیں جُڑاں سر ساکشہ تیغی جہاں مرشی
اناغہ درکفی روش اژہمے دہندو مژاں روشے
مروشی اے ڈغار تئ ایل پھل تئ ایں کشار تئ ایں
اغر ہیری دمے بیثہ کنوں ما لیکواں روشے

میر مٹھا خان نے ایوب خان کے دور میں سیاسی وجوہ کی بنا پر ریٹائرمنٹ لے لی(2)۔وہ بہت ہی خوددار، مرنجان شخص تھا، سیاسی بصیرت سے پُر، مگر بہت ہی سادہ انسان۔ہم بچوں کو اتنی عزت دیتا تھا کہ ہم اُس کے سامنے خود کو وی آئی پی سمجھتے تھے۔میر مٹھا خان انتہائی ایمان دار شخص تھا۔بہت ہمدرد، شفیق اور خاموش طبع انسان۔وہ داد، توصیف اور مرتبہ کی خواہشات سے بے نیاز تھا۔(3)

میر مٹھا خان سے میری نیاز مندی 1973 سے شروع ہوئی۔پہلی ملاقات ہی سے میں اُس کی عزت کرنے لگا۔وہ اپنی عزت خود کرواتا تھا۔جب آپ کسی جونیئر کو عزت بخشیں گے، اس کی حوصلہ افزائی کریں گے، اس کی انگلی پکڑ کر اسے چلنا سکھائیں گے، اُس کے ساتھ اپنائیت سے

پیش آئیں گے تو وہ آپ کی عزت کیسے نہیں کرے گا۔ میر صاحب میں یہ ساری خوبیاں موجود تھیں۔ وہ کوئی دکھاوا نہیں کرتا تھا۔ مصنوعیت والی عزت نہیں کرتا تھا بلکہ ایمانداری سے سمجھتا تھا کہ ہر انسان میں ٹیلنٹ اور جوہر موجود ہوتے ہیں۔ اس نے میری بہت ہی حوصلہ افزائی کی۔ میری نوجوانی کے دن تھے اور میں پرجوش انقلابی تھا۔ اس نے کبھی بھی میری حوصلہ شکنی نہ کی۔ وہ بہت ہی دھیرج کے ساتھ مجھ سے سعدی و حافظ کی باتیں کرتا تھا۔ وہ میری اُن کمیوں کو دور کرتا رہا جو جذباتی انداز میں سوشلزم میں بھرتی ہو کر ایک انسان میں رہ جاتی ہیں۔

بقول صمد خان اچکزئی ''میر مٹھا خان مری بہت دانا اور تعلیم یافتہ شخص ہیں۔ بلوچستان کانفرنس کے ممبر اور ہمارے ساتھی ہیں'' (4)۔ دسمبر 1932 میں جیکب آباد میں جو آل انڈیا بلوچ کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس میں وہ اس کانفرنس کی ایگزیکٹو بورڈ کا ممبر منتخب ہوا تھا۔

وہ بلوچی اکیڈمی کے بانی ارکان میں سے تھا۔ اور عرصہ دراز تک اس کا اہم عہدیدار رہا۔ وہ دو بار تین تین برس تک کے لیے اس کا جنرل سیکرٹری رہا۔

میر صاحب کے پاس علم کا ایک خزانہ تھا۔ وہ عام سی گفتگو میں بھی بڑے مصنفین کے بے ساختہ انداز میں حوالے دیتا تھا۔ اسے بلوچی، فارسی، انگلش، اردو، براہوئی اور سندھی پہ عبور حاصل تھا۔ اس نے بلوچستان کے مختلف علاقوں میں تعلیم دی اور نامور شاگرد پیدا کیے جن میں نواب خیر بخش مری، آزاد جمالدینی، میر عبداللہ جان جمالدینی، میر گل خان نصیر، اور میر نوشیروان مینگل شامل ہیں۔

میر مٹھا خان اپنے رویوں، طرزِ زندگی اور علمی کاوشوں میں قبائلی نظام سے بہت آگے کے دور کا نمائندہ تھا۔

پتہ نہیں پاکستان کے سرکاری اعزازات کی ناجائز بندر بانٹ کے بعد اُن کی کیا وقعت رہ جاتی ہے۔ مگر یہ ذکر کر ہی لینا چاہیے کہ میر صاحب کو حسنِ کارکردگی کا صدارتی ایوارڈ، آدم جی ایوارڈ، علامہ اقبال ایوارڈ، پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کا بہترین تصنیف کا ایوارڈ ملا۔ میر مٹھا خان مری 76 برس کی عمر میں 15 اپریل 1988 میں فوت ہوا۔

میر مٹھا خان مری نے ''شاعر اور قوم'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جو 3 دسمبر 1933 کے ہفت روزہ 'البلوچ' میں چھپی۔ (5) اُس میں میر صاحب نے بتایا کہ شاعر تو عوام کے احساسات اور جذبات کی نمائندگی کرتا ہے۔ شاعر وہ ہے جو عوام کو آزادی کی طرف راہنمائی کر سکے:

پھر آ گئی فصلِ بہاری پھر طوطیِ دراج و سار
ہیں خوش کہ وہ دن آ گئے جن کے لیے تھے بے قرار
گل ہے محو خواب، سرگرم ترنم ہے ہزار
سنبل نے ہے کھولی ہوئی یاں اپنی زلفِ مشکبار
ہے محوِ آئینہ وہاں سرو، کنارِ جوئبار
ہنستے ہیں وقتِ سحر گل بے سبب بے اختیار
رکھتی ہے جنت کا اثر یہ صبح کی بادِ بہار
نرگس کی آنکھیں کیوں نہ ہوں نشہ سے مے کے پُر خمار
ہر شاخ یوں جھومتی جس طرح رند بادۂ خوار
لُوٹیں نہ کیوں اہلِ چمن اِس موسمِ گل کی بہار
مل سکتے ہیں کس کو بھلا یہ عیش کے لیل و نہار
طاری گلشن پر ہوا اک عالمِ کیف و خمار
انجمن میں الغرض کوئی نہیں اب ہوشیار
ہاں ایک شبنم ہے جسے معلوم ہے پایانِ کار

مجھے اِسی ٹکڑے سے ملتی جلتی اُس کی شاعری کے چند اور مصرعے ملے ہیں۔

معلوم ہے اس کو کہ ہیں دفن فصلِ گل کے تین چار
ہونے کو پامال خزاں ہے دو دن میں ہے فصلِ بہار
اہلِ چمن کے غم میں کیوں روتی ہے ہر دم سوگوار
غفلت پہ اہلِ باغ کے روتی ہے شبنم بار بار

رہتا ہے غم میں قوم کے شاعر بھی یونہی سوگوار
کرتی ہے غفلت قوم اگر ہوتا ہے دل اس کا فگار (6)

میر محمد حسین عنقا نے میر مٹھا خان کے بارے میں یوں کہا تھا:

ہوا کس درجہ خوش پا کر خضر کو
کوئی گم گشتہ آئے جیسے گھر کو
بلوچستانیو! تم کو مبارک
یہ دیکھا اپنے میں اپنے راہبر کو

استاد مٹھا خان اپنے شاگرد عبداللہ جان کے بارے میں کہتا رہتا تھا:
''مجھے عبداللہ جان جیسے شاگرد پر فخر ہے۔''

حوالہ جات

1۔ ماہتاک بلوچی دسمبر 1987
2۔ زینہ کوئٹہ اپریل 1988
3۔ مری، دین محمد۔ میر مٹھا خان مری۔ ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان۔ اپریل 1989
4۔ اچکزئی، اودل سمد خان ''زماژوندا وژوندون'' جلد نمبر 2۔ صفحہ 523
5۔ کوثر' انعام الحق۔ بلوچستان میں اردو۔ صفحہ 370
6۔ مری' محمد خان میر مٹھا خان خضر مری نوکیں دور ستمبر 93 صفحہ 12

ہاشم خان غلزئی

جناب ہاشم خان غلزئی 1908 میں باز محمد خان کے ہاں نیچاری، کوئٹہ میں پیدا ہوا۔ تین برس کا تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ وہ اسلامیہ سکول میں چار جماعت تک پڑھا پھر سنڈیمن سکول چلا گیا اور 1927ء میں میٹرک پاس کیا۔ وظیفہ پا کر اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوا۔

وہیں فکرِ اقبال نے اس کے روح و قلب پر قبضہ کر لیا۔ یہاں کی سیاسی فضا نے اسے سیاسی بنایا اور وہ مکمل طور پر بدل گیا۔ جنگِ آزادی کے سالار یوسف عزیز مگسی اور میر عبدالعزیز کرد نے جب قلات کے ظالم و جابر وزیراعظم کے خلاف ''شمس گردی'' نامی کتابچہ شائع کیا تو ہاشم غلزئی نے اسے کوئٹہ میں تقسیم کیا۔ اس نے 1931 میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے گریجویشن کی۔

ہاشم خان غلزئی نے محسوس کیا کہ بلوچستان کے لوگوں میں تعلیم کا شوق نہیں ہے اور سرکاری ملازمتوں کا رجحان بھی نہیں ہے۔ چنانچہ خلوص وانکساری، دیانت وصداقت اور بردباری کا یہ مجسم شخص 1932 میں لوکل ایسوسی ایشن کا بانی بنا۔ اس کی تاسیسی میٹنگ میں میر یوسف مگسی اور عبدالصمد خان اچکزئی بھی شامل تھے۔

غلزئی صاحب 1932 میں انگلش ٹیچر مقرر ہوا اور لورالائی میں اُس کی تعیناتی ہوئی۔ اس نے بچوں میں تعلیم کا شوق پیدا کیا اور اُن کی فکری رہنمائی کی۔ جیکب آباد میں آل انڈیا بلوچ اینڈ

بلوچستان کانفرنس کے انعقاد کے پوسٹر جب لورالائی پہنچے تو ہاشم خان غلزئی نے انہیں دیواروں پر لگایا۔جس کی پاداش میں اسے سبی ٹرانسفر کیا گیا۔

ہاشم خان غلزئی 1935 میں نوشکی میں تھا۔زلزلے کے بعد اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور بار بار دیا مگر یار لوگ اُس سے استعفے واپس کرواتے رہے۔جو گیارہ برس بعد 1946 میں منظور ہوا۔اس نے اخبارات میں مضامین لکھنا شروع کیے۔انگریز کے سامنے بار بار کی پیشیاں ہوئیں مگر یہ استاد اپنے من کا پکا تھا۔

1937 میں مسلم لیگ میں شامل ہوا اور اس کی کانفرنس سے یہ قرارداد منظور کرائی کہ ''جب پاکستان بنے گا تو تمام صوبوں کو صوبائی خودمختاری ملے گی''۔ ہاشم غلزئی علی گڑھ وکیل بننے داخل ہو گیا مگر انگریز نے یہ بہانہ بنا کر اسے وہاں سے نکلوا دیا کہ اُس کا استعفیٰ منظور نہیں ہوا اور وہ ابھی تک سرکاری ملازم ہے۔مقصد تو اسے سیاست سے دور کرنا تھا۔مگر پاک بازی کی سیاست تو اُسے لگ چکی تھی۔

وہ دوبارہ ملازمت پر چلا گیا اور پشین میں طلبا کو پڑھانے لگا۔بالآخر 1946 کو استعفیٰ منظور ہوا۔اس نے اپنا کاروبار شروع کیا اور سیاست میں بھی عملاً داخل ہو گیا۔خان عبدالصمد خان اچکزئی کے ساتھ مل کر ''انجمن وطن'' بنائی۔

وہ پہلی مرتبہ 1948 میں گرفتار ہوا۔جرگے نے تین سال سزا ٹھوک دی، سازش کا جو الزام تھا ملک کے خلاف۔اس نے ضمانت داخل کرنے سے انکار کر دیا۔جیل سے رہائی کے بعد وہ اچکزئی، شورش اور یوسف غلزئی کے ساتھ مل کر سیاسی کام کرنے لگا، اور پھر انہی رفقا کے ہم راہ گرفتار ہوا۔ملک کے مفاد کے خلاف سرگرمیوں کے نام پر ایک اور سال جیل میں قربان کر دی۔

جب نیشنل پارٹی اور ورور پشتون ضم ہوئے تو جو نام نیشنل عوامی پارٹی پڑا، کہتے ہیں کہ وہ نام غلزئی صاحب کے زرخیز ذہن کی تخلیق تھا۔

بھلا ون یونٹ کے خلاف ایسا شخص خاموش رہ سکتا تھا؟۔چنانچہ 1960 میں وہ گرفتار، دو سال یہاں دے دیے۔1966 میں پھر گرفتار ہوا۔صوبائی خودمختاری اور عوامی حقوق کی پاسداری کا

علم بردار ہوا۔نیشنل عوامی پارٹی بنانے میں اس کا رول بہت اہم تھا۔بارہ برس کی جیل اس کے دائیں نامۂ اعمال میں ہے۔اس نے شادی نہ کی کہ وہ انقلاب کا میاں محمود احمد بھی تھا اور ڈاکٹر خدائیداد بھی۔

ہاشم خان غلزئی 1970 کے الیکشن میں سینٹ میں حزب اختلاف کا ڈپٹی لیڈر منتخب ہوا۔ بھٹو آیا تو غلزئی صاحب جیل میں۔حیدر آباد سازش کیس۔پانچ برس گزار کر 1977 میں رہا ہوا۔این ڈی پی بنائی۔اور 1983 تک اس کا صدر رہا۔بعد ازاں عوامی نیشنل پارٹی بنی تو غلزئی صاحب اس میں شامل ہوا۔وہ زندگی کی آخری سانسوں تک اس پارٹی میں رہا۔ہمارے اس مومن بزرگ نے ساری جائیداد قوم کے نام وقف کر دی۔اور ایک رفاحی ادارہ ''ہاشم روغتون'' کے نام سے قائم کیا۔یہ ایک مفت ہسپتال تھا۔

اس کی وصیت تھی کہ اسے یوسف علی خان مگسی کے پہلو میں دفن کیا جائے۔مگر یہ وصیت پوری نہ ہو سکی کہ ایسی متبرک جگہوں پہ قابضین پہلے ہی براجمان ہو جاتے ہیں۔جب یہ معلوم ہوا کہ مگسی صاحب کے پہلو میں جگہ نہیں ہے تو اس نے یہ عجیب فرمائش کر ڈالی، ''جمال الدین افغانی اور امان اللہ خان کو مدتوں بعد ترکی اور یورپ سے کابل لا کر دفن کر دیا گیا۔اور اگر کبھی ایسا جذبہ بلوچستان کے عوام میں پیدا ہوا اور ابتدائی دور کے سیاسی راہنماؤں کو ایک جگہ دفن کیا گیا تو میری ہڈیوں کو بھی اُن کے قریب دفن کر دیا جائے۔یہ میری آخری خواہش ہے''۔(1)

حوالہ

1۔بابو، عبدالرحمٰن کرد۔خان محمد ہاشم خان غلزئی۔شمارہ 12، 1993 صفحہ 10

میر غوث بخش بزنجو

میر عبداللہ جان کے بڑے بھائی بنگل خان (عبدالواحد آزات جمالدینی) کو چھ جماعتیں پاس کرنے کے بعد کوئٹہ کے سکول میں داخل کرا دیا گیا تھا۔اس لیے کہ پانچویں جماعت کے بعد نوشکی میں کوئی سکول موجود نہ تھا۔علم کی تلاش میں اِن دونوں بھائیوں کی یہ دوڑ دھوپ زندگی بھر جاری رہی۔مگر علم تو اُس حسینہ کی مانند ہے جو ایک درشن دے کر پیاس سوگنا بڑھا دیتی ہے۔بنگل خان نے کوئٹہ جا کر چھوٹے بھائی کو بھی اپنے پاس بلوا لیا۔

یوں میر عبداللہ جان کو، سنڈیمن ہائی سکول کوئٹہ میں داخل کیا گیا جہاں اس کا بڑا بھائی آزاد جمالدینی پہلے ہی قدح درقدح علم ودانش نوش کر رہا تھا۔یہاں بڑے بھائی کی رہنمائی اسے اعتماد بخشتی ہے، اسے مستقبل کی واضح شاہراہ عطا کرتی ہے اور اسے نچلے طبقے سے وابستگی عطا کرتی ہے۔

مگر یہ کافی نہ تھا۔

اس لیے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ افلاک کے ''ہرکارے'' ماما کی تربیت کے لیے آزات جمالدینی اور مٹھا خان کا انتظام تو کریں، مگر بڑے غوث بخش کا نہ کریں؟ ۔لہٰذا، یہ انتظام بھی کر دیا گیا۔تقدیر نے لا کے ڈال دیا عبداللہ جان کو کوئٹہ کے ایک ایسے مکان میں جس کے پڑوس میں بابا

بزنجو اپنی والدہ کے ساتھ رہتا تھا۔ماما اپنے بھائی آزات کے ساتھ برج لال سٹریٹ کے عقب میں رہتا تھا۔صرف پڑوسی ہی نہیں بزنجو صاحب تو اس کے بڑے بھائی آزات صاحب کا دوست بھی تھا۔اور یہ وہ زمانہ ہے جب عبداللہ جان سنڈیمن ہائی سکول کے پرائمری سیکشن میں پڑھتا تھا اور میر غوث بخش بلند تر سیکشن میں۔چنانچہ اس نئے ٹیوٹر کا ان کے پاس آنا جانا شروع ہوا اور اس وقت تک جاری رہا جب جانے کا وقت ہوا بزنجو کا دنیا سے۔اسی بزنجو نے اپنا سارا علم ودانش، جمہوری طرز، شائستگی، استدلال اور دھیرج عبداللہ جان کو عطا کرنے تھے۔

میر عبداللہ جان چوتھی کلاس میں پڑھتا تھا اور اس کا بھائی دسویں میں۔یہاں عبداللہ جان سخت بیمار پڑتا ہے۔اسے ٹائیفائیڈ ہوگیا تھا۔اس کا چچا اسے کوئٹہ سے نوشکی لے گیا۔جب صحت یاب ہوا تو اُسے وہیں نوشکی میں داخل کر دیا گیا۔اس نے پانچویں جماعت پاس کی۔مقصد اِس ٹائیفائڈ کا بہت ہی اہم تھا۔اس نے اسے کوئٹہ میں آنے والے 31 مئی 1935 کے آدم خور زلزلے سے بچا لیا تھا۔

مگر ابھی تو قوسِ قزح کے رنگ ادھورے تھے، کشٹ وریاضت کے کچھ اور مقامات سے گزرنا ابھی باقی تھا، ابھی برگزیدگی کی کئی سیڑھیاں طے کرنی تھیں۔ابھی آسمانِ علم کے کچھ اور تاروں نے جھرمٹ میں شامل ہونا تھا۔چنانچہ واحد طالب علم عبداللہ جان تھا جو اپنی پوری کلاس میں سے سرخرو ہوا۔سکالرکو سکالرشپ مل گیا۔

سنڈیمن ہائی سکول پشین واحد سرکاری ہائی سکول تھا جہاں وظیفہ یافتہ طلبا کو داخلہ ملتا تھا۔واضح رہے کہ 1935 کے بڑے زلزلے میں کوئٹہ تباہ ہوا تو سنڈیمن ہائی سکول، کوئٹہ سے پشین منتقل ہوگیا۔

میر عبداللہ جان سنڈیمن سکول پشین چلا گیا۔اسے کیا خبر تھی کہ جاہ وحشمت کی سازشوں کا بہ یک وقت مالک اور شکار ایک بادشاہِ مملکت، خان خدائیداد خان وہیں دفن ہے جس کے اپنے بیٹے نے انگریز کے کہنے پر باپ سے اس کا تخت چھینا اور اپنے پیارے والد کے گلے میں چمڑے کے دھاگے سے لٹکتی ہوئی شاہی مہر ہاتھ کے جھٹکے سے توڑ کر قلات کی بادشاہی ہتھیا لی۔خان خدائیداد

خان اگر فیوڈل بادشاہی کا انجام تھا تو انگریز سامراج کی چیرہ دستیوں کے شکار انسانوں کی علامت بھی تھا۔عبداللہ جان اس گزرگاہ سے صبح شام گزرتا اور عبرت وسبق کے انبار چنتے جاتا۔

سنڈیمنیز میں ایک بہت اچھی بات یہ تھی کہ وہ مختلف گروپس بناتے تھے۔کھیلوں سے دلچسپی رکھنے والوں کا اپنا گروپ ہوا کرتا تھا، سیر سپاٹے اور تفریحات سے دلچسپی رکھنے والے طلبا کا اپنا، اور مطالعہ کرنے والوں کا اپنا گروپ۔عبداللہ جان کی دلچسپی اسی گروپ کے ساتھ ہوئی جو مطالعہ کرنے والوں کا تھا۔اس گروپ کا روح رواں عبدالصمد تھا جو کہ شاعر وحکیم عبدالعلی اخوندزادہ کا بھتیجا تھا۔یہ 1938 کا زمانہ ہے جب علامہ اقبال کا کلام ہی مطالعہ ومباحثہ کا مرکز ہوتا تھا۔صمد کو علامہ اقبال کا کلام پورے کا پورا یاد تھا۔پہلے ہی سے متاثر عبداللہ جان پر اب اقبال کا جادو مزید چڑھنے لگا۔

اِدھر آسمانوں کے سپاہی رضائے فطرت کے تحت ماما کی رفاقت کے لیے دو اور بڑوں کو دھر لائے تھے۔یہ دونوں مہان انسان کمال خان شیرانی اور ڈاکٹر خدائیداد تھے۔سائیں کمال خان، ماما کی طرح اپنے علاقے ژوب سے سکالرشپ جیت کر آیا تھا۔چنانچہ شمال مشرق کا یہ ستارہ جنوب مغرب کے ستارے کا جڑواں بنا۔اور یہ جوڑی ایسی ہوئی کہ آج بھی عبداللہ جان کو ژوب میں کمال خان والا عبداللہ جان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔اور ژوب کے کمال خان کو نوشکی میں ''میر کمال خان'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔میر کمال خان انتقال کر گیا۔ہماری دعائیں تھیں کہ خدا کرے نوشکی کا یہ میر، میرا آپ کا میر اور فکر ودانش کا میر تادیر زندہ سلامت رہتا۔مگر وہ بھی خدا کا مال تھا، خدا کے حوالے ہو گیا۔

ڈاکٹر خدائیداد کے نام کے بغیر بلوچستان میں بھلا دانش وآگہی کا مثلث کب مکمل ہوتا ہے؟۔خدائیداد کے ذکر کے بغیر نہ تو عبداللہ جان کی جیون کہانی بیان ہوسکتی ہے، نہ کمال خان شیرانی کا تذکرہ مکمل ہوسکتا ہے، نہ لٹ خانہ چل سکتا ہے، نہ مارکسسٹ تحریک کی تاریخ لکھی جاسکتی ہے، نہ پشتو بلوچی ادب کا ارتقا بیان ہوسکتا ہے، فن وثقافت کا سفر نامہ لکھا جاسکتا ہے اور نہ انسان دوستی کا تسلسل صورت پذیر ہوسکتا ہے۔اپنے حصے سے بڑھ کر کام کر کے مغربی کوئٹہ کے گرم آغوش میں

محو استراحت ہے میرا یہ بزرگ۔

بلوچستان کا یہ trio اقبال کے کلام کا گرویدہ تھا۔بقول خدائیداد ان لوگوں کی سوچ بدلنے کے لیے اقبال کے ایسے اشعار موجود تھے:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

یا.....

دیہہ خدایا، یہ زمیں میری نہیں، تیری نہیں (1)

آپس میں ملنے جلنے، بات چیت کرنے اور پیہم ایک ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں گفتگو کے عنوان اکثر علمی موضوعات ہوا کرتے تھے۔یہ لوگ باجماعت علامہ کا کلام پڑھا کرتے تھے۔اس کے بامقصد اشعار کے مطالب پر گفتگو ہوتی تھی۔جس سے یہ لوگ بہت انسپیریشن لیتے تھے۔ان کا تعارف، مارکس، لینن، ہیگل، نٹشے، گوئٹے، رومی، ٹیگور اور دیگر بڑی ہستیوں سے علامہ اقبال ہی کے کلام سے ہوا۔

علامہ اقبال باوجود بہت عظیم شاعر ہونے کے بلوچستان میں وسیع حلقہ کبھی بھی نہ بنا سکا۔اس کی ساری شاعرانہ عظمت، آزادی کے بعد داغدار کر دی گئی۔اس لیے کہ اس کی شاعری کو حاکموں نے اپنے اقتدار کے دوام کے ناپاک مقصد میں بہت بے شرمی کے ساتھ بڑی بے دردی سے استعمال کیا۔عبداللہ جان جمالدینی میر مٹھا خان مری کے بعد وہ اولین بلوچ ہے جس نے سب سے پہلے اعلان کیا کہ اس کی ساری شعوری اٹھان مطالعہِ اقبال سے ہوئی ہے۔اس کے دوست کمال خان اور خدائیداد خان کے بقول ان کا آپس میں تعارف اور دنیا کے بڑے مفکروں اور فلاسفروں سے ان کی شناسائی اقبال کی شاعری کے ذریعے ہی ہوئی۔پروفیسر عبداللہ جان نے ''شکوہ، جوابِ شکوہ'' اس وقت زبانی یاد کیا جب وہ ابھی سکول میں پڑھتا تھا۔ان ''تین'' کے درمیان دوستی کا بندھن اقبال کی شاعری تھی۔گو کہ بعد میں عبداللہ جان کو فیض احمد فیض اور گل خان نصیر کی شاعری میں بھی دلچسپی پیدا ہوگئی مگر وہ ہمیشہ خود کو مقروض، اقبال کا بتاتا تھا۔اس نے لینن اور سوشلزم کو اقبال کی شاعری کے ذریعے دریافت کیا۔

ڈاکٹر خدائیداد کا کہنا تھا کہ عبداللہ جان کی شخصیت بہت پرکشش تھی۔ اتنا ملنسار، شیریں زبان اور بااخلاق کہ ہر طالب علم اس کی قربت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تین کا یہ ٹولہ ستر برس تک بلوچستان میں عوامی فہم کے گراف میں مستقل ابھار کا ذریعہ رہا۔ پشتون بلوچ کا یہی اٹوٹ تجسم اگلے ستر جنموں تک برقرار رہے گا۔ کوڑھی ہوں وہ لوگ جو اس جسم پہ نفاق کا خنجر چلانا چاہیں۔

''تین کے اس ٹولے نے یہاں کی تہذیبی اور سیاسی تاریخ میں ایسے انقلاب آفریں کام سرانجام دیے جن کی مثال دیگر سیاسی اور معاشرتی تحریکوں میں نہیں ملتی۔ تینوں ترقی پسند اور پرولتاری فقیروں نے، اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی نظریاتی کام کیے بغیر نہیں گزارا اور اگر کچھ وقت ملا بھی تو پڑھنے اور لکھنے میں گزارا''۔(2)

ستمبر 1939 میں ماما عبداللہ جان کا والد فوت ہو گیا۔ وہ اس وقت نویں جماعت کا طالب علم تھا۔

یہ تینوں دوست چھٹی کے دن پشین سے کوئٹہ آ جاتے۔ یہاں آ کر سیدھے ایک چودھری کی دکان میں گھس جاتے۔ اس کا نام چوہدری محمد حسین تھا۔ مشن روڈ پر واقع اس کی دکان کا نام تھا؛ ''مسلم بک ڈپو''۔ چوہدری صاحب ان نونہالانِ وطن کو کتاب بیچتا نہیں تھا بلکہ یہ کتب فروش ایک اچھی سی کتاب منتخب کرتا اور قرطاس وقلم کے ان تین دیوانوں کو تھما دیتا کہ ''جاؤ اسے پڑھو، اسے میلا کچیلا نہ کرو، اور اگلی چھٹی کے دن واپس کر دو''۔

یوں علامہ اقبال ایک غیر محسوس طریقے سے اِن نوخیز ذہنوں پہ اثر کر گیا۔

میر عبداللہ جان فطرت کی اس ساری منظّم پلاننگ میں 1940 میں میٹرک پاس کرتا ہے، فرسٹ ڈویژن میں۔

اس مرحلے پر خدائیداد وقتی طور پر ان دونوں دوستوں سے جدا ہوتا ہے۔ وہ میٹرک کرنے کے بعد دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں سگنل فورس میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اور دورانِ جنگ ہندوستان اور ایران کے کئی علاقوں میں رہا۔ جنگ کے اختتام پر اس کی فورس فارغ کر دی گئی تھی اور

وہ کوئٹہ میں ٹیلی فون کے محکمے میں لگ گیا۔

عبداللہ جان مزید تعلیم کے حصول کے لیے علیگڑھ جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مگر اس کے اس فیصلے کو اس کے اچھے اتالیق جناب ہاشم غلزئی نے تار پیڈو کر دیا۔ وہ اپنے استاد کے مشورے کے تحت علی گڑھ کے بجائے 1941 میں اسلامیہ کالج پشاور چلا گیا۔ اس کا گہرا دوست کمال خان شیرانی بھی اس کے ساتھ ہی اسی کالج میں داخل ہو گیا۔ وہ دونوں ایک ہی کمرے میں رہنے لگے اور ذہنی طور پر اس قدر قریب تھے کہ کالج کے اساتذہ اور طلبا سب حیران رہ گئے۔ سو روپے والے نوٹ کے پیچھے چھپی تصویر والے اسلامیہ کالج نے 1945 میں انہیں گریجویٹ بن کر تباہ کن سیاسی غلطیاں کرنے اور ان غلطیوں کا برملا اعتراف کر کے ان سے سیکھنے کے لئے عملی میدان میں جھونک دیا۔ جی ہاں! ماما نے افسوس ناک غلطیاں کیں، ایک پورا مقالہ ان غلطیوں پر لکھا جا سکتا ہے۔ مگر جو نہی ادراک پایا ان غلطیوں کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ ان کا کفارہ بھی ادا کر دیا۔ اسی لیے تو وہ پیر نہیں بنا، عام خطا کا پتلا مگر بڑا عبداللہ جان بنا.....عبداللہ جان جس نے مروج نعرے بازیوں میں دو چار ڈبکیاں ماریں اور، پھر جلد ہی سنبھل کر اپنی سمت سیدھی کر لی۔ اور تب اس سیدھی صراط پر چلتا ہی رہا، چلتا ہی رہا، نہ لالچ سے ڈگمگایا، نہ خوف سے کپکپایا اور نہ اکیلے پن میں مرجھایا۔

زہ رحمٰن د عشق پہ درد کشے ہسے خوش یم
چہ مے نشتہ پہ دوا ندے غرض

(3)

حوالہ جات

1۔ خدائیداد، ڈاکٹر۔ پیش لفظ۔ ''لٹ خانہ''۔ سنگت اکیڈمی آف سائنسز کوئٹہ۔ صفحہ 7

2۔ بریالی۔ عبدالکریم ''محبت کے پیکر.....'' ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔ اپریل 2005

3۔ رحمٰن بابا کے شعر کا ترجمہ یوں ہے:

میں رحمٰن دردِ عشق میں ایسا مسرور
کہ مجھے دوا کی کوئی غرض نہیں

صاحبزادہ ادریس

اس کالج میں سائیں اور ماما کی زندگانی کے سب سے بڑے حاصل کو اُن کا استاد بننا تھا; جسمانی طور پر اپاہج مگر علم و دانش میں قطب کے چمکتے اس ستارے کا نام صاحبزادہ ادریس تھا۔ وہ پشتو کا بہت اچھا شاعر اور اس زبان کا اولین ناول نگار تھا۔

یہ بڑا عالم اور عظیم انسان دو مارچ 1902 کو جدید تعلیم سے منور صاحبزادگان کے ہاں پیدا ہوا تھا۔ وہ دو سال کی عمر میں اپاہج ہو گیا اور چلنے کے قابل نہ رہا۔ مگر کئی پاؤں والوں کی رفتاریں بڑھانے کے li اے گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل ہوا۔ بچپن کے کچھ ابتدائی سال اپنے ماموں صاحبزادہ فضل الرحمٰن صاحب کے ساتھ گزارے جو ڈیرہ میں مہتمم خزانہ تھا۔ پیروں سے معذوری کی وجہ سے اس کی تعلیم میں تھوڑی سے حرج آئی۔ اور اس کے کچھ برس ضائع بھی ہو گئے۔

1923 میں اس نے میٹرک پاس کر لیا۔ 1927 میں اسلامیہ کالج سے اکنامکس میں بی اے آنرز کیا۔ پھر وہ علی گڑھ چلا گیا اور ایم اے، ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اس کے بعد مردان میں وکالت کی کوشش کی مگر اس کے اپنے بقول ''جھوٹ کی دکان'' نہ چلی۔ پھر 1932 سے 1937 تک اس نے سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان، جو اس وقت صوبے کا وزیر اعلیٰ تھا، کے نائب کی حیثیت سے کام کیا۔ 1938 میں اس نے اسلامیہ کالج میں پولیٹیکل سائنس اور اکنامکس

ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ وہ 1953 تک وہیں رہا۔ 1953 میں وہ یونیورسٹی میں اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کا چیئرمین مقرر ہوا۔ 1959 میں وہ ریٹائر ہو گیا۔ 1961 میں یونیورسٹی نے اس کی خدمات ایک تحقیقی کام کے لیے حاصل کیں اور چھ سال تک وہ یہ کام کرتا رہا۔ 1967 میں اس نے اپنی پانچ رپورٹیں پیش کیں۔ اور اپنا کام مکمل کر دیا۔

اس نے 1942 میں شادی کی۔ اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ڈاکٹر نگہت یاسمین اس کی بڑی بیٹی ہے۔ اس کا بڑا بیٹا کینیڈا میں انجینئر ہے۔ اس کی چھوٹی بیٹی چارسدہ میں میجر شیر شاہ کے ساتھ بیاہی ہوئی ہے۔ چھوٹا بیٹا ڈاکٹر سہیل سپیشلسٹ ڈاکٹر ہے۔

صاحبزادہ صاحب جب ایف ایس سی میں داخل ہوا تو اس دوران وہ پشتو میں شاعری کرنے لگا تھا۔ 1938 میں جب وہ اسلامیہ کالج آیا تو اس نے ایک طویل مضمون Why Thou Shall Not Hate پڑھا۔ اس نے کہا کہ، ہر شخص جو کام کرتا ہے اس کے خیال میں وہ صحیح ہے۔ اسی طرح ایک گناہ گار جب گناہ کرتا ہے تو اس کے خیال میں وہ کام صحیح ہوتا ہے۔ اُس کی تعلیم تھی کہ جسمانی معذوروں کے ساتھ ہم دردی ضروری ہے۔ اسی طرح ذہنی مریضوں کے ساتھ بھی ہم دردی کرنی چاہیے۔

اس نے اور بھی کئی مضامین لکھے تھے۔ اس زمانے میں ہی اس نے سوشلزم اور اسلام پر چار چھ تقریریں کیں۔ پھر اس نے ایک مضمون The Economic Implication of an Islamic State لکھا۔ یہ مضمون بعد میں یونیورسٹی جرنل میں شائع ہوا تھا۔

وہ مفلوج شخص چار برس تک ان دو، نوخیز ذہنوں کی تربیت کرتا رہا۔ کھیل دیکھیے آسمانوں کے کہ ٹھیک 60 برس بعد شاگرد (عبداللہ جان) کو بھی مفلوج بننا تھا اور اسی فالج کی حالت میں بھی ہزار مورچے سنبھالنے تھے۔ ان میں سے ایک مورچہ، نوخیز ذہنوں کی تربیت کا بھی تھا۔

صاحبزادہ دراصل اپنی پسند سے استاد نہیں بنا تھا۔ وہ وکیل تھا۔ مگر اپنے ''کرتوتوں'' کے باعث یہاں اسلامیہ کالج میں پٹخ دیا گیا تھا۔ اور اگر وہ وکیل رہتا تو کمال خان، سائیں کمال خان کیسے بنتا، عبداللہ جان کی تربیت کون کرتا؟۔

ہوایوں کہ صاحبزادہ ادریس علی گڑھ سے وکالت پاس کر کے آیا تھا۔ اور یہاں آ کر وکالت شروع بھی کی تھی۔ قصہ خوانی بازار میں اوپر کی منزل پر ایک دکان لی، دکان میں خوب صورت فرنیچر ڈالا اور زبردست کتابیں سجادیں۔

ایک دن ایک مؤکل قتل کا مقدمہ لے کر وکیل صاحب کے پاس آیا۔ اس نے صاحبزادہ کو اپنا پورا کیس سنایا۔ صاحبزادہ نے اس کی روداد سن کر پوچھا:

''تو گویا تم نے قتل کیا ہے؟''۔

''جی ہاں'' مؤکل بولا۔

''اور مجھے تمھیں بری کروانا ہے؟''۔

''جی ہاں۔''

صاحبزادہ صاحب نے اپنی وکالت کی ساری کتابیں کھڑکی سے باہر پھینک دیں اور کہا:

''میں جھوٹ نہیں بولتا''۔

اور ٹھیک نصف صدی بعد اس اپاہج وکیل کا مفلوج شاگرد لکھ رہا تھا: ''سچ کو ہمیشہ منظرِ عام پر لایا جائے تا کہ اہلِ بصارت اور انسان دوست لوگ اس سے واقف ہو کر سماج کی اصلاح کر سکیں''(1)۔

صاحبزادہ صاحب کا ایک بہت ہی مقبول اور خوبصورت ناول ''پیغلہ'' ہے۔ اس نے اپنی ایک اور کتاب ''گلے وسوسے'' کو ''انسانیت کے نام'' سے منسوب کیا ہے۔ اس کی کتاب ''باتور'' کا انتساب ہے: ''فکر کی آزادی کے نام''۔ اسی طرح ''دسہیل ستورے'' کا انتساب ہے: ''اپنے بچوں یاسمین، شکیب، نزہت، سہیل کی ماں کے نام جو مجھے شاعری کرنے سے منع کرتی ہے''۔ اس کی شاعری کے دو اور مجموعے بھی ہیں: گردابِ فکر، اور سوز و ساز۔

اس کی شاعری سوشلسٹ انقلاب اور انسانیت کے حق میں ہے۔ وہ نوآبادیاتی نظام کا سخت مخالف تھا۔ صاحبزادہ صاحب سرمائے کی غلط تقسیم کی درستگی چاہتا تھا۔ وہ ایک بہت ہی قوم پرست، اور انسانیت دوست مفکر تھا۔ اس کے کلام میں جا بجا آپ کو زندگی سے بھرپور پیار نظر آئے

گا، مقصد کی یکسوئی ملے گی، اور بھوک جہالت اور غلامی کے خلاف لڑنے کی ترغیب ملے گی۔

اس کی زبان بہت سادہ بہت رواں ہے۔ عمدہ، خالص، عام، سادہ اور مہذب زبان۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس بڑے آدمی کے اثر میں آنے سے قبل عبداللہ جان باقاعدہ ملاّ بن چکا تھا۔ اقبال کی گاڑی بنی ہی اس طرح سے ہے کہ اس کا سٹائرنگ بائیں جانب مڑتا ہی نہیں، جام ہو جاتا ہے۔ اور اس میں صرف دائیں پھرنے کا آپشن موجود ہے۔ چنانچہ ماما کی، بحثیں، کپڑوں کا ڈھب سب کچھ جماعت اسلامی والے ہو چکے تھے۔ بقول سائیں کمال خان کے ''اس کی مبارک ریش پانچ، چھ انچ لمبی تھی۔ وہ معدے کی تیزابیت اور بے خوابی کا شکار ہو گیا تھا۔ بے قراری، اخلاقی ٹھیکیداری، زہد و عبادت''۔۔۔۔ وہ تو پکا ملاّ بن گیا۔

یہیں کالج میں مودودی صاحب لیکچر دینے آیا مگر سائیں کے اس سوال کا تسلی بخش جواب نہ دے پایا:

''اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟''۔۔۔ اور سائیں کمال خان کے لیے گویا یہ دروازہ حتمی طور پر بند ہو گیا۔

صاحبزادہ ادریس سے فلسفہ تو سیکھا ہی، لیکن اگر وہ اسے معیشت کی نازک نازک شیطانیاں نہ بتاتا تو عبداللہ جان و کمال خان شاید وہ حتمی راہ اختیار نہ کرتا جو بعد میں اُس کا مقدر اور یہاں کے عوام کی خوش بختی بنا۔ انسانی زندگی (اور بالخصوص طبقاتی سماج) کے سارے آلام اسی معاشیات کی باریک موشگافیوں میں تو پنہاں ہیں۔ لفظ ''قدرِ زائد'' ہی تو وہ خبیث اصطلاح ہے جس نے پوری انسانی تاریخ میں آزادیِ ذہن و جسم کا گلا دبائے رکھا ہے۔ یہ گرہ صاحبزادہ نے کھول کر اپنے شاگردوں کے سامنے رکھی۔

یہاں اسلامیہ کالج میں اُس کا ایک اور استاد تھا شیخ تیمور۔ اس نے اپنے شاگرد کو برٹرینڈ رسل کی کتاب Religion & Science پڑھوائی۔

پشاور قیام کے دوران عبداللہ جان اور کمال خان کا کاجی صنوبر حسین اور عبدالرحیم پوپلزئی جیسی عظیم شخصیات کی زندگیوں اور ان کے سیاسی فکر سے آشنا ہوا۔

مگر جب وہ چھٹیوں پر اسلامیہ کالج پشاور سے ژوب کے راستے گھر آ رہا تھا تو ڈیرہ اسماعیل خان میں اس کے کلاس فیلو، ہم سفر اور دوست کمال خان شیرانی ایک نائی کو پکڑ لایا اور یوں ماما کی ملاّ گیری کے رجحانات کی داڑھی کے آخری بال بھی تراشنے میں اُس کی مدد کی۔ اور اسے دوبارہ ''انسان'' بنا دیا گیا۔ (دوستی نہ ہوتی تو یہ تو بہت بڑا جرم ہوتا!!)۔

حوالہ

1۔ جمالدینی۔ دیباچہ، شاہ محمد مری کی کتاب ''بلوچ قوم۔ عہد قدیم سے عصرِ جدید تک''۔

کاکا جی صنوبر حسین

(جنوری 1897۔ تین جنوری 1963)

جس کا سر کبھی بھی خزاں کے آگے نہیں جھکا
تبھی تو پیاری ماں نے اس کا نام صنوبرؔ رکھا

اِدھر 1896 میں جنوب مشرق میں مست توکلی خیر و نیکی کے اولمپک مشعل کو، ہوا کی حفاظت میں چھوڑ کر، مادرِ وطن کی مٹی میں جا سوتا ہے تو اُدھر شمال مشرق میں جنوری 1897 کے اندر اِس مشعل کو تھامنے کے لیے ''ٹیڑھے نالے'' (کژہ ویالہ) کے مقام پر مومند گھرانے میں صنوبر حسین نامی بچے کا جنم ہوتا ہے۔ مایوسیاں برطرف، ناشُکریاں برطرف' مست و صنوبر کی یہ انسان دوست مشعل' آج خطے کے ہزاروں ہاتھوں نے تھام رکھی ہے۔

اپنے آپ پر ناز کرنا بہت اچھی صفت ہوتی ہے۔ مگر شاید خود افتخاری کا سب سے معتبر اور مستقل معیار یہ ہے کہ آپ ''حق'' کی راہ پہ چلتے رہیں۔ ''برحق'' رہنے سے بڑی نیکی شاید ہی ہو۔ ہم خوش نصیب لوگ ہیں کہ ''برحق'' راہنماؤں کے پیچھے پیچھے چلنے والے ہیں۔ صنوبر حسین ہمارے

ایسے ہی ''حق باز'' بزرگوں میں سے ایک تھا۔ اپنی شاعری میں ایک جگہ کہتا ہے:

تمہاری غزل کے پرسوز مصرعوں کی قسم
خستہ جاں خٹک کے
پھٹے پرانے لباس کی قسم
مفلس و نادار محنت کشوں کے
مقدس پسینے کی قسم
مظلوموں کی آہ و فریاد کی قسم
بیوہ بہنوں کی
سسکیوں کی قسم
پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا
حق بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا

یہ تو بہت بے وقوفی کی بات ہوگی کہ اگر حق کی خاطر لڑنے والوں میں فرق کی باتیں کی جائیں۔ وہ سب انسان بڑے تھے جنہوں نے اپنے زمانے کے ''حق'' کی طرف داری کی۔ کاکا جی اور اُس کے ہم عصروں کے زمانے میں انگریز دشمنی حق کی بات تھی۔ اس لیے انسانوں کا ایک بہت بڑا انبوہ سامراج دشمنی کی برحق جدوجہد میں جتی رہی۔ اُن میں کون بڑا تھا اور کون کم بڑا تھا، اس بحث میں پڑنے سے آدمی خود چھوٹا ہو جاتا ہے۔

البتہ جان و مال و جوانی کی قربانی دینے والوں میں سے کسی کو نظر انداز کرنا بہت بڑا جرم ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کتنی زیادہ باتیں اکٹھی ہو کر یہ نتیجہ بناتی ہیں کہ کاکا جی، باچا خان سے کم مشہور رہ جاتے ہیں۔

کاکا جی تو پشتون قومی عوامی تحریک کی تاریخ میں اُن اولین راہنماؤں میں سے ایک تھے جو صرف سامراج دشمن نہ تھے۔ بلکہ وہ داخلی طور پر سوشلزم بھی چاہتے تھے۔ اُس عہد کے باقی تقریباً

سارے راہنما صرف سامراج کے خلاف لڑے۔ کاکا جی بھی انگریز کے خلاف مسلح جدوجہد سمیت ہر میدان میں نہ صرف لڑے بلکہ وہ اس کے ایجنٹوں، خانوں، جاگیرداروں، زرخرید ملاؤں اور پیروں کے خلاف بھی فکری اور عملی محاذ پر لڑتے رہے۔ وہ امتیازی طور پر سوشلزم کے خواہاں بھی تھے۔ شاید پشتون قوم میں وہ اولین کمیونسٹ راہنما ہیں۔

کاکا صنوبر حسین کی اب تک جتنی بھی تصویریں میں نے دیکھی ہیں۔ اُن میں وہ بالکل ایک سیدھے سادے انسان نظر آتے ہیں۔ اپنے مخصوص پشتون لباس میں جس میں وقار اور بھاری پن ہے۔ اُن کی جدوجہد بھی اسی قدر باوقار اور بھاری پن سے لبریز رہی ہے۔ روشن خیال، انسان دوست، وطن پرست..... مکمل طور پر عام انسان۔ اُسی طبقے کا رنگ ڈھنگ جس طبقے کی وہ سیاست کرتے تھے۔ سو فیصد انقلابی، سولہ آنے سیاسی مبارز۔ اُن کی سوانح حیات کا مطالعہ کریں تو تعجب ہوتا ہے کہ اس متنوع شخصیت میں صحافت، شاعری اور ادب کی اضافی خوبیاں بھی بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

''پٹھان پیدائشی سوشلسٹ ہے۔ پٹھان کا تو ہر کام مشترک ہے۔ پٹھان کا حجرہ ہزاروں سالوں سے انسان دوستی کا ایک نمونہ ہے''۔(1) وہ حیرت سے کہتے: ''عجیب بات ہے..... بھلا زمین بھی کسی کی ہو سکتی ہے؟ زمین تو اس کی ہے جو سینہ اور پسینہ دیتا ہے''۔ اپنے نظریات کے حوالے سے ہی وہ ابوذر غفاریؓ سے بہت متاثر تھے۔

انگریز جب اس چوبندا انقلابی کی سرگرمیوں سے تنگ آ گیا تو ان کے خلاف بغاوت کا مقدمہ تیار کر لیا۔ گرفتاری سے بچنے کیلئے کاکا جی نے علاقہ غیر کی طرف ہجرت کی۔ اور غازی آباد میں آزادی کے ایک بہت بڑے سامراج دشمن انسان حاجی صاحب ترنگزئی کے ساتھی بن گئے۔ کاکا صنوبر حسین 1932 سے لے کر 1948 تک (سولہ برس) پشاور چھوڑ کر قبائلی علاقہ میں جلاوطن رہے۔ اور وہاں سے انگریز کے خلاف مسلح جنگ منظّم کی۔ یعنی ایک اور امتیازی صفت اُن میں اور ان کے دیگر ہم عصر راہنماؤں میں یہ تھی کہ وہ صرف سیاسی میدان میں انگریز کے مخالف نہ تھے بلکہ انہوں نے 1930 کی دہائی کے اولین سالوں میں مشہور ترین انگریز دشمن جنگوں میں حصہ لیا، کمانڈر کی حیثیت سے۔

کا کا جی عوام کے نباض تھے، دو منٹ میں عوام کو ابھار سکتے تھے، یہ کہہ کر:

میرے بھائی! تم تو شیر تھے، لیکن اب
کیوں نہیں دھاڑ سکتے، وطن تباہ و برباد ہو گیا
اور تم کم ہمتی کے غار میں پڑے ہو،
تمہاری ہمت جواب کیوں دے گئی، تم اب کیوں نہیں اٹھ سکتے
زہر بھری سبز چائے نے یا دودھ ملی چائے نے
یا پھر تمہارا کام تمام کیا ہے دونوں نے

یک دم عوام کو اُن پر بھروسہ آ جاتا اور وہ فوراً اُن کے ساتھ آ ملتے۔ اور انگریز کی ساری چالیں دھری کی دھری رہ جاتیں۔

کا کا جی اِس مصمم انگریز دشمنی کے ساتھ ساتھ اپنے وطن میں جاگیرداری بھی ختم کرنا چاہتے تھے، تعلیم اور صحت مفت کرنا چاہتے تھے۔ عورتوں کو حقوق دلانا چاہتے تھے۔ وہ مظلوموں کی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔

وطن کو برباد کیا ہے، اُجلے چہروں
یا اُجلی پگڑی والوں نے، یا دونوں نے
اس گھر کو آگ لگا دی ہے اپنوں نے
پرایوں نے، یا دونوں نے

کا کا صنوبر حسین اپنے ہم عصروں سے یہ امتیاز بھی رکھتے تھے کہ وہ اٹک سے اُس پار افغانستان تک ترقی پسند تحریک کے بانی ہیں۔ وہ اِس نظریے کے پشتونوں میں شاید اولین مبلغ ہیں۔ وہ طبقاتی اونچ نیچ کے خلاف تھے اور زندگی بھر رجعت پسند عناصر کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔

ان کی قربانیاں کبھی کسی سے کم نہ رہیں۔ کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ حق کی راہ میں کا کا جی بڑے سے بڑے سامراج دشمن سے کسی بھی طرح کم قربانیاں دینے والے رہے ہوں۔ شاید کیا یقینی بات ہے کہ صنوبر حسین کی فکری اولاد میں یہ کمزوری رہ گئی ہو کہ وہ اپنے استاد کی قومی

عوامی خدمات کو محنت کے ساتھ پیش نہ کر سکے۔

ہمارے اس نامعروف رہ جانے والے کا کا جی کے والد کا نام گل فراز خان تھا۔ کاشت کار گل فراز قوم میں مہمند تھے۔ والد نے بیٹے کی تعلیم کا بندوبست گھر میں کیا تھا۔ یہ بہت دلچسپ دور تھا۔ پورا سنٹرل ایشیا اور پورا برصغیر بچوں کی تعلیم گھر اور گھر کے قریب کیا کرتا تھا۔ گھر، سکول ہوا کرتے تھے۔ گھر، سعدی کا مسکن ہوا کرتے تھے۔ انگریز نے آ کر ہمیں نہ یہاں کا رہنے دیا نہ وہاں کا۔ حافظ و سعدی متروک ہوئے اور بے برکت ڈپلوما آ گیا۔ جس کا نہ ذائقہ ہے نہ بُو، جو نہ وزن رکھتا ہے، نہ جگہ گھیرتا ہے۔ پورا خطہ تعلیمی میدان میں میر مٹھا خان مری کی بجائے راجا احمد خان کے حوالے ہو گیا۔

کا کا جی گھر کی اس ضروری تعلیم کے بعد گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل ہوئے۔ انہوں نے میٹرک اسلامیہ ہائی سکول پشاور سے کی۔ مگر اُس کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ اور سکول ٹیچر بنے۔ مگر انقلابی فکر اور حریت پسند طبیعت کے سبب دیر تک انگریز کی نوکری نہ کر سکے۔ سرکاری نوکری چھوڑ دی اور مزدوروں کسانوں میں آزادی اور سوشلزم کے لئے کام کرنے لگے۔ خدائی خدمت گار تحریک میں نہ ٹک سکے، اسی طرح کانگریس جیسی دوسری تنظیموں کے چوکھاٹ بھی انہیں سہار نہ سکے۔

ماحول اور گرد و پیش کا اثر تھا کہ یہ بڑا آدمی شاہ ولی اللہ کے نظریات سے متاثر ہوا۔ خام خام، دھندلے دھندلے نظریات لیے اس نے باقاعدہ سیاست 1920 سے شروع کی۔ نہ منظّم پارٹی تھی اور نہ بالغ نظر پلیٹ فارم تھا۔ لہٰذا اس بے قرار روح نے 1926 میں ''انجمنِ زمینداران'' کے نام سے ایک تنظیم بنا بیٹھا۔ ایسے ہی، سیاست کی دیوی کا داس بننے کو کچھ کشٹ تو کرنا ہی تھا۔ وہ جو بڑے کبیر نے کہا تھا Where ever you are, is the entry point، سو یہی عشق کی وادی کا انٹری پوائنٹ بنا۔ کا کا جی کاشتکاروں اور کسانوں کے حقوق کا تحفظ کرنے والی تنظیم بنا بیٹھے۔ اردو والے، زمیندار جاگیردار کو کہتے ہیں جب کہ ہم بلوچ اور پشتون عام کاشت کار کو زمیندار کہتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک اور گم راہ کن لفظ ہے: مالدار۔ جسے اردو والے سرمایہ دار سمجھتے ہیں اور ہم

مویشی بان کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال جب صنوبر حسین کی یہ تنظیم ذرا سی چل پڑی تو اس نے اس کا نام ''جمعیت نوجوانِ سرحد'' رکھا۔ ایسے ہی برائے نام نہیں بلکہ مولانا عبدالرحیم پلوپلزئی (صدر)، سید میر بادشاہ (جونیئر نائب صدر)، اور بخشی فقیر چند (جنرل سیکرٹری) جیسے جید وقد آور راہنماؤں کے ساتھ۔ وہ خود اس تنظیم کا سینئر نائب صدر تھا۔ جس نے بعد میں ''نوجوانانِ بھارت سبھا'' بننا تھا۔ عبدالرحمٰن ریا اور عبدالعزیز خوش باش اُن کے رفیق وسنگت تھے۔ اس طرح کاکا جی ہندوستانی سیاست میں شامل ہوا۔ اور پھر حزب اللہ تحریک میں۔ ''نوجوانانِ سرحد'' کی سربراہی عبدالرحیم پوپلزئی جیسے سامراج دشمن کے پاس تھی۔ انہوں نے انگریز دشمن تحریکوں میں عملی حصہ لیا۔ دلچسپ انداز میں یار کی تلاش میں سرگرداں ہمارہر بزرگ درجن بھر پارٹیاں بناتے بناتے حتمی پارٹی تک آن پہنچا ہے۔ یہ جماعت آگے جا کر سوشلسٹ پارٹی میں تبدیل ہوگئی۔ اس کے چیدہ چیدہ مقاصد میں غیرملکی غلامی سے نجات اور اُس کے بعد ایک سوشلسٹ ریاست کا قیام تھا۔ 1930ء کے قصہ خوانی بازار کے خونی واقعہ کے روز بھی کاکا جی صنوبر حسین مومند نوجوان بھارت سبھا کے دوسرے ساتھیوں کے ہم راہ موجود تھا۔

مگر کاکا نے ایک بات بالکل نہ بدلی۔ وہ عدم تشدد کے فلسفے کو گولی مارتا تھا۔ وہ اسے ''بانجھ فلسفہ'' کہتا تھا۔ (پتہ نہیں بلوچ پشتون بانجھ کی بجائے نامرد کا لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں، حالاں کہ بانجھ لفظ کا مترادف موجود ہے)۔ کاکا جی انگریز کے خلاف، اور غلامی کے خلاف عدم تشدد کی بات کو بہت بڑا لطیفہ سمجھتا تھا۔

کاکا جی سر سے پاؤں تک مکمل اور بھرپور سامراج دشمن تھا۔ نہ بندوق بچا کر رکھی، نہ تقریر وتحریر اور نہ شاعری:

پشتون کے آگے سفید فام ڈاکو کس نے بے نقاب کر دیا
مجلسِ اقوام میں اسے کس نے شرمندہ کیا، بولو تو سہی
دشمنوں کے فریب کا جال کس نے جلا کر بھسم کر دیا
مظلوموں کی آہ نے، یا ہمارے شعلوں نے، یا دونوں نے

کاکا ایک زبردست خطیب تھا، بہت اچھی اور متاثر کن تقریر کرتا تھا۔ بہت سارے لوگوں نے اُس کی وہ تقریریں بہت پسند کیں جو اس نے دسمبر 1929 میں لاہور میں منعقدہ کانگریس نوجوان بھارت سبھا، خلافت اور کیرتی کسان وغیرہ کے سالانہ اجلاسوں میں کیں۔

ماسٹر صنوبر حسین نے پشتو زبان میں صحافت شروع کی۔ 1930 کی تحریک آزادی میں چھ ماہ کے لیے جیل گیا۔ (2) رہا ہو کر پشتو اور اردو ہفت روزہ ''سیلاب'' پشاور سے جاری کیا۔ یہ نوجوان بھارت سبھا کا ترجمان تھا۔ (3) یہ بڑا ہی طوفانی پرچہ تھا اور اس کے مدیر کی تحریر میں بلا کا زور اور روانی تھی۔ ابھی اس کے محض چار پرچے نکلے تھے کہ 25 دسمبر 1931 کو اُس کی گرفتاری کا ارادہ ہوا۔ پرچہ بند ہوا۔ الزامات سخت تھے۔ اس لیے ساتھیوں کے مشورے سے کاکا جی اپنے ساتھیوں صاحبزادہ محمد اسلم، سید امیر باچا اور مرتضیٰ باچا کے ساتھ روپوش ہوگیا۔ وہ پھر حاجی صاحب ترنگزئی کے پاس ''لکڑو'' چلا گیا اور حاجی صاحب کی زندگی کی آخری سانسوں تک انگریز سامراج کے خلاف جنگ میں شامل رہا۔ حاجی صاحب کے انتقال کے بعد وہ اپنے ساتھیوں سمیت ''سوال قلعہ'' میں ملک محمد عمر خان اتمانخیل کے ساتھ سامراج دشمن جنگ میں شامل ہوا۔ یہیں پہ 1933 میں ایک رات صاحبزادہ محمد اسلم پر انگریز کی سازش سے کسی نے گولی چلائی۔ صاحبزادہ سخت زخمی ہوگیا۔ کاکا جی نے اپنے کامریڈ کو علاج کے لئے جلال آباد کے ایک ہسپتال تک پہنچایا مگر کوششوں کے باوجود وہ 26 جنوری 1934 میں شہید ہوگیا۔

انہوں نے 1930 میں علاقہ غیر میں ہاتھ والا پرنٹنگ مشین لگایا جہاں وہ برطانیہ کے خلاف پوسٹر اور کتابچے شائع کر کے لوگوں میں تقسیم کرتے تھے۔ ان کے رسالے کا نام ''سرفروش'' تھا جو انہوں نے 1930 میں شروع کیا تھا۔ صنوبر حسین اخبار کے ایڈیٹر بھی خود تھے، کاتب بھی خود، وہ اخبار کے پرنٹر بھی خود تھے اور بائنڈر بھی خود، وہ اس کے ہاکر بھی خود تھے اور فنانسر بھی خود۔ کتنا دلچسپ ہے کہ ایک شخص خود ہی مالک بھی ہے اور ٹریڈ یونینسٹ بھی۔

کاکا جی کا ہر پرچہ نکلتا اور ضبط ہوتا تھا۔ ''شعلہ'' نکالا، ''سرفروش'' نکالا، سب انگریز

نے بند کر دیے۔

کاکا صنوبر حسین اپنی مادری اور قومی زبان پشتو کے شیدائی تھے اور انہوں نے اپنی تصانیف کا سب سے بڑا حصہ پشتو زبان میں لکھا۔ اس لیے کہ اُن کے قاری، اُن کے مخاطب لوگ یہی زبان بولتے اور سمجھتے تھے۔ کاکا جی جیسے لوگوں کے لیے زبان نہیں عوام اہم ہوتے ہیں، نظریات اہم ہوتے ہیں۔ زبان وسیلہ ہے اپنے مؤقف کو دوسروں تک پہنچانے کا۔ اور کاکا جی کا مخاطب پشتون تھے۔ لہٰذا انہوں نے پشتو میں صرف بولا نہیں، صرف لکھا نہیں، صرف اسے سینچا سنوارا۔ انہیں بلکہ وہ اپنے عہد کے اور شاید بعد کے بہت عرصے تک پشتو کے بلند پایہ عالم، شاعر اور ادیب بنے۔ وہ پشتو برائے پشتو اور پشتون برائے پشتون والے پشتون نہ تھے، نہ ہی وہ پشتون کو ایک واحد قوم سمجھتے تھے۔ بہت واضح انداز میں وہ اِس قوم میں دو قومی وجود کے قائل تھے۔

میرے بھائی ادیب!
یہ ایک الگ طبقہ ہے
یہ ایک الگ مدرسہ ہے
تمہاری آرزو الگ ہے
اُن کا نشہ الگ
ہمارا اپنا کعبہ ہے
اُن کا کعبہ الگ ہے
اُن کا مذہب حکومت کرنا
اُن کا مذہب سلطنت ہے
وہ اعلیٰ حضرت کہلاتے ہیں
کیا ہوا اگر انہوں نے
اپنا نام سلمان رکھا ہے

یا پٹھان اور افغان رکھا ہے

کاکا جی صنوبر حسین پشتو ادب کے نگہبان تھے۔ انہوں نے اپنے دور کے ادبی جمود کو توڑ کر ترقی پسند ادب کی بنیاد ڈالی۔ ''اولسی ادبی جرگہ'' (1951) انہوں نے ہی تو قائم کیا تھا۔ (دلچسپ بات ہے کہ بعد میں جب مشہورِ عالم انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگ گئی تو ملک میں جو متبادل تنظیم بنا دی گئی اس کا نام اولسی ادبی جرگہ (عوامی ادبی انجمن) رکھا گیا۔ جرگہ کا تاسیسی اجلاس 14 مارچ 1952 میں ہوا۔ کاکا جی اس کے سیکرٹری بنے۔ وہ اِس ادبی جرگے کے زیرِ اہتمام شعر و ادب سے وابستہ لوگوں کی تربیت و راہنمائی کرتے رہے۔

ترقی پسندی اور پشتو کاکا جی کے محبوب ترین مظاہر تھے۔ انہوں نے روشن فکر اور ترقی پسند مزاج سے بھری تیرہ کتابیں لکھی تھیں۔ ہمارے معاشرے میں اس بے اولاد شخص کی کتابیں کون چھاپے گا، بس اُن کتابوں کے نام ہم نے بھی سُن رکھے ہیں، آپ بھی سنتے جایئے:

- مقالاتِ صنوبر
- مضامین و انشائیے
- سوانح عمری حضرت ابوذر غفاری
- پشتو صرف و نحو
- حضرت عمر
- تاریخ اسلام
- سفر نامہ ابن بطوطہ (پشتو ترجمہ)
- شاہ ولی اللہ
- گورِ غریباں
- پشتو ادبیات کی تاریخ
- فتنۃ الکبریٰ (پشتو ترجمہ)

-شعری مجموعہ،......اور......

-رباعیات عمر خیام(پشتو ترجمہ)......

یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ سبھاش چندر بوس جب قبائل کے راستے افغانستان جارہے تھے تو وہ کاکا جی کی ملاقات کے iiے بھی گئے تھے۔ وہاں سے افغانستان تک کا باقی سارا بندوبست کاکا جی نے کیا تھا۔

آزادی کے کچھ عرصہ بعد کاکا جی پشاور آئے۔صحت تباہ،شہر اور شہری زندگی سے کٹے کاکا جی نے اپنے نظریاتی مشن کو جاری رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔اور یہیں پر انہوں نے اپنے مورچے کے ساتھی اور کامریڈ،صاحبزادہ محمد اسلم کی یاد میں ''اسلم'' نامی جو ماہنامہ نکالنا شروع کیا، جو خالص ادبی پرچہ تھا۔

کاکا جی اپنے حلقے سے صوبائی اسمبلی کے لیے الیکشن میں امیدوار بھی بنے تھے......اور ناکام ہوئے۔مرزا ابراہیم ناکام، سوبھو گیان چندانی ناکام............جاگیرداری اتنی بھی بے وقوف نہیں کہ اپنے دشمنوں کو حکمرانی کے قریب آنے دے!

اپنے جاگیردار دشمن نظریات ہی کی وجہ سے بعد کی پاکستانی حکومتوں نے بھی انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی چین سے نہ رہنے دیا۔ بدنما چہروں والے جاسوسوں کے جال میں رہے کاکا جی۔ اس بڑے انسان کو بغیر کسی جرم کے 1952 میں پاکستانی سرکار نے گرفتار کر کے ڈیرہ اسماعیل خان کی جیل میں ڈال دیا۔

اور پھر ایوبی مارشل لا کے دوران انہیں اکتوبر 1958 سے لے کر فروری1959 تک راولپنڈی اور شاہی قلعہ میں اذیتیں دی گئیں۔اس گرفتاری سے قبل وہ ''بانگِ حرم'' نامی ایک ہفت روزہ میں پشتو حصے کے ایڈیٹر تھے۔لاہور شاہی قلعہ کا تہہ خانہ دمہ کے مریضوں پر کیا قیامت ڈھاتی ہوگی، کاکا جی کے علاوہ کون جان سکتا ہے۔کاکا کہتے ہیں جب وہ مجھے تہہ خانے سے لا رہے تھے تو دو سیڑھیاں چڑھتا تو سانس پھول جاتا۔اور میں بیٹھ جاتا۔میری یہ حالت دیکھ کر ایک پولیس افسر نے دوسرے سے انگریزی میں کہا،''میری سمجھ میں نہیں آتا اس زندہ لاش سے ہماری حکومت کو کیا

خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔''(4)

بقول احمد ندیم قاسمی: ''صبح کو جب ہماری بارکوں کے تالے کھلتے اور سب قیدی اپنے احاطے کی چار دیواری کے اندر ٹہلنے نکلتے تھے تو کاکا جی ایک گوشے میں بیٹھے کھانستا نظر آتا تھا۔ اس کی سانسیں بول رہی ہوتی تھیں۔مگر اس عالم میں بھی وہ ایک ایک کا مزاج پوچھتا۔رات کیسے کٹی؟،نظم مکمل کر لی؟'بیٹی کے نام خط لکھ لیا؟۔کون سی کتاب پڑھی؟،کیا حاصل کیا؟......اور میں سوچتا تھا کس کا بلا کا انسان ہے جو دوسروں کے سامنے اپنی ذات کو ہمیشہ فراموش کیے رکھتا ہے۔''(5)

جنوری ہی میں پیدا ہونے والا کاکا صنوبر حسین جنوری ہی میں بقول قاسم بنوی ''جدائی کے سپاہیوں کے ہاتھوں'' قبر کا قیدی بنا۔ 3 جنوری 1963 کو۔ وہ بقول ناظم حکمت صرف ایک ارمان قبر تک لے گیا۔اور وہ ارمان تھا اپنی نظم کے نامکمل رہنے کا: کاش وہ جاگیرداری نظام کو ختم ہوتے دیکھ سکتا۔

پشتو کے ایک چوٹی کے ادیب دوست محمد کامل نے کاکا جی کی شخصیت پر مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بہت لکھا ہے:

- کاکا جی کبابوں کی دوکان پر
- کاکا جی چائے کی دکان پر
- کاکا جی ڈاکٹر کی دکان میں
- کاکا جی کامل کے گھر میں
- کاکا جی اولسی جرگے کے اجلاس میں

اپنی عین جوانی میں کاکا جی اپنے علاقے سے جلاوطن تھا، انگریز سے برسرِ پیکار تھا اور انگریز جاسوس اُس کے سر کی قیمت لگائے بیٹھے تھے۔ایسے میں ظاہر ہے کہ کاکا جی نے شادی نہیں کی تھی، میاں محمود نے شادی نہیں کی تھی، ڈاکٹر خدائیداد نے شادی نہیں کی، ہوچی منہ نے شادی نہیں کی تھی۔

ہمیش خلیل نے ایک بہت ہی خوب صورت بات لکھی: ''............البتہ وہ اپنے گاؤں کی ایک ہندو لڑکی کی محبت میں گرفتار تھا۔ کاکاجی کو پتہ چلا کہ وہ بھی محبت کے سوال کا محبت سے جواب دیتی ہے۔ مگر مذہبی رکاوٹ نے اسے ایک دوسرے کو ازدواجی رشتہ سے دور کر دیا............اور اس طرح دلوں کی آرزو کی تکمیل کے ارمان چند دہائیوں کے بعد ایسا خاموش ہوئے، محبت کا ساز اس طرح چھُپ گیا، محبت کی چنگاریوں کو حالات اور واقعات کی راکھ نے ایسا چھپا دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ لیکن ستر سال بعد جب کاکا پنڈی کے زندان کی ایک کوٹھڑی میں مجھ سے یہ قصہ بیان کر رہا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دل کے چنار پر آج بھی ارمان کا ققنس اپنے محبت کے سوز و ساز کے راکھ بننے کے آرزو میں اپنے راگ کے انتہا تک پہنچ گیا ہے۔'' (6) اب جا کے کاکاجی کے اِس خوبصورت شعر کا مطلب سمجھ پایا ہوں:

بے ستا د کڑو ورو خُولہ محرابہ

سُم کافر کہ بہ مے بل ځایئے کشے سرکیشود

ہمارے منطقے میں کہیں کہیں انقلاب کے زندہ اور مردہ شہیدوں کی منگیتریں دوسری شادیاں نہیں کیا کرتیں۔ کاکاجی کی منگیتر نے بھی شادی نہیں کی۔ بھگت سنگھ شہید کی منگیتر نے بھی شادی نہیں کی تھی۔

کاکاجی نئے عہد کے پشتو ادب کے معمار ہیں۔ وہ دکھی انسانیت کے نمائندہ تھے۔ آج پشتو کے تمام وہ نام جو انقلاب اور ترقی پسندی سے وابستہ ہیں، اُن کے پیچھے پہاڑ جیسی شخصیت کاکاجی کی تعلیمات اور تربیت موجود ہے۔ ان کا ''اولسی ادبی جرگہ'' ادیبوں شاعر کو نظریاتی راہنمائی عطا کرتا تھا۔ (7)

افضل بنگش کاکاجی کی یاد میں ایک ہفت روزہ ''صنوبر'' نکالنے لگے تھے جو اردو اور پشتو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ ہم قلندر مومند کے اس شعر پہ اپنی بات ختم کرتے ہیں:

حال ''آخرکار'' کا ہاتھ تھام لے گا،

اور مستقبل کاکاجی کا ہوگا!

حوالہ جات

1- سلیم راز/ خدائیداد۔ کاکاجی صنوبر حسین مومند۔ ماہنامہ سنگت نومبر 2000۔ صفحہ 9

2- اجمل ملک۔ صحافت صوبہ سرحد میں۔ 1980۔ قومی پبلشرز انارکلی لاہور۔ صفحہ 77

3۔ اجمل ملک۔ صحافت صوبہ سرحد میں۔ 1980۔ قومی پبلشرز انارکلی لاہور۔ صفحہ 77

4- ہمدانی، رضا۔ کاکاجی صنوبر حسین بحوالہ حنیف خلیل کی کتاب کاکاجی صنوبر اکیڈمی آف لیٹرز۔ 2006۔ صفحہ 39

5- قاسمی، احمد ندیم۔ حنیف خلیل کتاب کاکاجی صنوبر۔ اکیڈمی آف لیٹرز 2006۔ صفحہ 40

6- ہمیش خلیل۔ کاکاجی صنوبر حسین مومند۔ ماہنامہ پشتون نیوز کوئٹہ۔ دسمبر 2008۔ صفحہ 35

7- حسرت، محمد زبیر۔ 1998۔ اولسی ادبی جرگہ۔ دادبی دوستانو مرکہ مردان۔ صفحہ 37

میر عبداللہ جان کی تربیت ایسی شخصیات کے بیچ ہوئی۔ واقعی پشاور نے اس کے فکری دریچے کو بہت وسعت بخشی۔ پشاور ایک ایسا سانچہ بنا جہاں سے نوشکی کی ریگ کے اس فرزند نے ایک واضح صورت، اور ایک منظّم سمت اختیار کر لی۔۔۔۔ پشاور بلوچ کا محسن شہر بنا۔

عبداللہ جان کا والد فوت ہو چکا تھا۔ بعد میں اس کا بڑا بھائی بھی گھر چھوڑ کر ایران چلا گیا۔ اُس زمانے میں اسلامیہ کالج میں ایم اے کی کلاسیں بھی نہیں ہوتی تھیں۔

ان تمام وجوہات کی بنا پر میر عبداللہ جان مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ اور واپس بلوچستان آ گیا۔

تعلیم یافتہ کاشش وپنج

حصولِ تعلیم سے واپسی پر ماما عبداللہ جان کچھ عرصہ بے روزگار اپنے گاؤں میں رہا، جس کے بعد محکمہ جنگلات کوئٹہ میں جونیئر اسسٹنٹ کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔

اُس کی اِس ملازمت کے زمانے میں ایک بار پھر ان تینوں کے مل بیٹھنے کا سلسلہ چل نکلا۔ اُن کی پرانی ملاقاتوں اور اب کی نشستوں کے موضوعات و معروضات میں بہت فرق آ چکا تھا۔ اب تو انھوں نے کچھ دنیا دیکھ لی تھی۔ اور عالمی حالات سے اچھی خاصی شناسائی پیدا کی تھی۔ ان کو سجاد ظہیر کی ترقی پسند ادبی تحریک کا پتہ لگ چکا تھا۔ وہ پریم چند کے افسانے پڑھ چکے تھے۔ انہوں نے انگریز سامراج کے خلاف جاری تحریک آزادی سے شعور و آگاہی حاصل کی تھی۔ وہ یورپ کے بڑے بڑے لکھنے والوں اور انقلاب کے فلسفے سے آگاہ ہو چکے تھے۔ میکسم گورکی جیسے ادیبوں کی تخلیقات نے ان کے ذہنوں میں نئے خیالات پیدا کر لیے تھے۔

انھوں نے ایک بار پھر اقبالؔ کے دربارِ دانش کی خاکروبی کی۔ سامراج سے آزادی کی تحریک میں وہ لوگ کسی نہ کسی طرح سے حصہ لینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ مگر بلوچستان جیسی سرزمین پر جہاں جہالت کے اندھیرے میں گھسے پٹے رواجوں کا راج تھا، اپنے لیے ایک صحیح راستہ متعین کرنا تقریباً ناممکن نظر آ رہا تھا۔ ایسے حالات میں امید کی جو ایک ہلکی سی کرن نظر آ رہی تھی، وہ یہ تھی کہ یوسف عزیز مگسی، عبدا لصمد خان اچکزئی، اور میر عبدالعزیز کرد جیسے لوگ سامراج دشمن تحریک میں شریک تھے۔ اور عوام میں

سیاسی شعور کی روشنی پھیلانے میں مصروف تھے۔ آزادی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ یہ رہنما، اپنی سرزمین کو ماقبل فیوڈل نظام کی لعنت سے پاک کرنے کے مقاصد بھی رکھتے تھے۔

اس دوران نائب تحصیل داری کی نوکری عبداللہ جان اور کمال خان دونوں کو ملی تھی۔ کمال خان گلستان میں متعین ہوا تھا اور عبداللہ جان نصیر آباد کے مقام حیر دین میں۔ ماما محکمہ سپلائی کے لیے کاشت کاروں سے اناج کی خریداری کر کے سرکاری ٹھیکیدار کے حوالے کرتا تھا۔

پٹ فیڈر کا یہ نہری علاقہ عبداللہ جان کے لیے بالکل ایک نئی دنیا تھی۔ وہ خود تو بے آب و گیاہ نوشکی کے قبائلی سماج کا فرزند تھا۔ ایسی سخت جان قبائلیت جسے جدید سائنس نے اندر سے تو کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا مگر اِس کے نخرے ابھی سلامت تھے۔ وہ قبائلیت تو آج بھی اکڑی گردن کے ساتھ موجود ہے۔ اور نامردی کی دوا کی ملاوٹ کے شبہ میں پولیو ویکسین مسترد کر کے لنگڑے لولے بچے جنتی رہتی ہے۔ مگر وہاں نہری جاگیرداریت میں، تو اُس نے ظلمت و اندھیر، محکومی اور توہم پرستی دس گنی گہری پائی۔ وہاں تو کلف لگے لباسوں میں بلوچی تھیریم جیسی توندوں اور بے محابا مونچھوں والے بے ترس جاگیردار تھے۔ دوسری طرف استحصال زدہ خلقِ خدا تھی، بے یار و مددگار اور غلامی کی حد تک دبے کچلے لوگ تھے۔ جن کی ہر دعا اور فریاد اِنہی جاگیرداروں کی اوطاقوں کے فلٹر سے ہو کر ہی دارالحکومت یا آسمان کی طرف جاتی تھی۔ اُن دہقانوں کے ڈھور ڈنگر سے لے کر ماں بہن تک، ووٹ اور رائے سے لے کر اکٹھ اجتماع تک، اور عقیدہ و ایمان سے لے کر ذاتی پسند ناپسند تک سب کا اختیار بھوتار کے پاس تھا۔ مُلّا، ملازم اُسی بھوتار کے، اے سی ڈی سی اُسی آقا کے، اور تھانہ کچہری سب اُسی وڈیرے کے مقرر کردہ تھے۔ عوام الناس کے پاس ناتکمیل شدہ حسرتیں تھیں، نیچی کی ہوئی مونچھیں تھیں اور بے سامان جھونپڑیاں تھیں۔ مقابل جگمگ کرتے محل تھے، کیکڑے نما ڈراؤنی گاڑیاں تھیں اور سؤر آنکھوں والے باڈی گارڈ تھے۔

اس سب کچھ پہ ہمارا تحصیل دار عبداللہ جان حیران پریشان کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے جاگیردار اُن کسانوں کے بیچ آپسی لڑائیاں کرواتا تھا، پھر انہیں تھانے بند کرواتا تھا اور اپنے تھانے دار سے دونوں فریقوں کو پٹواتا تھا۔ وہ بالخصوص یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ یہاں سازشیں، جبر

واستبداد، اطاعت وبغاوت، غم واندوہ، غیرت وسیاہ کاری اور جرگہ ممبری اور ووٹ باہم سختی کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ ایسے مناظر جہاں کوئی یونین، ٹریڈ یونین نہ تھا، کوئی انجمن، سیاسی پارٹی نہ تھی، کوئی حامی مددگار نہ تھا۔ بس، آدم کی اولاد تھی اور ننگا ظلم تھا۔

ایسی غیر انسانیت دیکھ کر عبداللہ جان کی طرح کے باضمیر شخص کے شعور کی گردن نے شرم سے جھک جانا ہی تھا۔ اس انقلابی نوجوان اور تعلیم یافتہ تحصیل دار کا فخر بھرا پاک دل ہل کر رہ گیا اور اولادِ آدم کی اس بے بسی نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔

اپنی اس ملازمت کے دوران اس نے نصیر آباد کے علاقے میں بدترین فیوڈل ازم دیکھا۔ ظلم و جبر کی حقیقی کہانی، جو کسی کتاب میں درج نہیں کی جاسکتی۔ اس نے یہاں پر کسانوں کی تباہ حالی دیکھی، سرکاری افسروں کی رشوت ستانی اور جاگیردار طبقہ کی من مانیاں دیکھیں۔ غریب طبقہ پامال تھا۔ ماما کو فیوڈل ازم سے بدترین دشمنی پیدا ہوگئی۔ وہ پہلے سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ کسانوں کی نجات کی جدوجہد میں شامل ہونے کا سوچنے لگا۔

پھر اسی زمانے میں چین کا انقلاب ہو گیا تھا، جس سے یہ نوجوان بہت متاثر ہوا۔ بلاخوفِ تردد کہا جاسکتا ہے کہ عبداللہ جان جمالدینی اسی زمانے سے اپنے نظریات رکھتا ہے۔

ان نظریات میں اولین بات یہ تھی کہ فیوڈل ازم کا خاتمہ کیا جائے۔ وہ سمجھنے لگا کہ رجعت، خواہ وہ مذہبی ہو، قبائلی ہو یا قومی، انسانیت کی بدترین دشمن ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ سرقبیلوی نظام کا سخت مخالف بنا۔ وہ تعلیم کے حصول کو انسانیت کی کنجی قرار دینے لگا۔ بالخصوص سائنسی علوم کو عین انسانیت سمجھتا تھا۔ میر صاحب نے طبقاتی نقطۂ نظر اپنایا۔ وہ اپنی شناخت اس طبقے کے ساتھ جوڑنے لگا جو کہ استحصال شدہ ہے۔

وہ کچھ عرصہ تو اپنی سرکاری افسری استعمال کر کے یہاں وہاں پیوندیں لگاتا رہا۔ مگر اُسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ لوہے کی تاروں سے بُنا ہوا ظلم کا یہ سماج اس قدر وابستہ و پیوستہ ہے کہ ایک فرد، یا ایک آدھ جھٹکے سے اس کی مضبوطی میں کوئی فرق نہ پڑے گا۔ چنانچہ اس نے انفرادی کے بجائے اجتماعی سبیل کا سوچا۔ اُس نے اس سارے جاگیرداری نظام سے ہی استعفیٰ دے دیا۔ تحصیل داری

چھوڑ دی اور کوئٹہ جا کر باقاعدہ سیاست شروع کر دی۔

لیکن وہ کسی مشہور اور مین سٹریم، خان صاحب نواب صاحب کی پارٹی میں نہ گیا۔ اس کو پتہ چل چکا تھا کہ ساری شخصیات، سارے ادارے، اور ساری پارٹیاں پٹ فیڈر کے انہی جاگیرداروں کے نظام کی حفاظت کے لیے قائم تھیں۔ یہ سب ایک دوسرے کی حفاظت اور خدمت کرتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک متبادل سیاسی پلیٹ فارم چاہتا تھا۔ اُس وقت یعنی 1950 سے لے کر 2016 کو اپنی موت تک کے چھیاسٹھ سال اس نے یہی متبادل سیاسی تنظیم کھڑی کرنے کی جدوجہد میں لگا دیے۔

ماما سماج میں خواتین کی غیر انسانی زندگی کو بدلنا چاہتا تھا۔ اس کا اپنے استاد کی اس بات پہ مکمل ایمان رہا کہ ایک اچھے اخلاقی نظام کے لیے پردہ ضروری چیز نہیں ہے بلکہ پردہ تو الٹا ایک اچھے اخلاقی نظام کے قیام میں ایک رکاوٹ ہے۔(1)

میر صاحب نے بلوچ عوام کی تباہ و برباد سماجی زندگی کو بدل ڈالنا چاہا۔ وہ اپنے عوام کی زندگی کے مصائب اور دکھوں کو بہت گہرائی سے محسوس کرنے لگا۔ میر عبداللہ جان ظلم و جور اور بے انصافیوں پہ بہت کڑھنے لگا۔ اس نے انہیں انسانی سماج سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے جدوجہد کرتے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

ملازمت لینے (پہلے پہل ایک کلرک اور بعد میں ایک نائب تحصیل دار) کے پانچ برس بعد اس نے ملازمت چھوڑ دی۔

واضح رہے کہ کمال خان نے طے شدہ منصوبے کے تحت سب سے پہلے نائب تحصیل داری کے عہدے سے استعفیٰ دیا۔ یہ ایک طویل احتجاجی مضمون کی صورت میں تھا۔ اُن کے بعد جمالدینی، بہادر خان بنگلزئی اور خدائیداد بھی ملازمت سے مستعفی ہوئے۔

عبداللہ جان کی عمر اس وقت 28 برس تھی۔

حوالہ

1۔ صاحبزادہ ادریس/ حیران خٹک۔ دوشیزہ۔ 1994۔ اکادمی ادبیات، پاکستان صفحہ 164

لٹ خانہ تحریک

ماما نے نائب تحصیل داری کی ملازمت اس لیے تو نہ چھوڑی تھی کہ خاموش ہو کر بیٹھ جائے۔ بلکہ اس کے ذہن میں تو ایک بڑا سیاسی خیال اور نظریاتی تحریک چلانے کے منصوبے موجزن تھے۔ چنانچہ نائب تحصیل داری چھوڑ دینے کے بعد عبداللہ جان جمالدینی، سائیں کمال خان شیرانی، ڈاکٹر خدائیداد اور ان کے دیگر دوست کوئٹہ میں جمع ہو گئے۔ انہوں نے مارچ 1950 میں کوئٹہ میں ایک مکان کرائے پر لے لیا، دس روپے ماہانہ پہ۔

ان سب تحصیل داروں کی رہائش گاہ بھی وہی تھی اور پارٹی ہیڈ کوارٹر بھی وہی واحد کمرہ تھا۔

بلوچی سٹریٹ پر واقع' اس مکان نے ''لٹ خانہ'' کا دیومالائی نام حاصل کیا۔ جس کا مطلب تھا؛ ''فارغ لوگوں کی جگہ''۔ یہ لٹ خانہ اگلے تین برس تک بلوچستان میں آرٹ اور علم کا سکول بنا رہا، اور اس تحریک کا مرکز بھی بن گیا، جس کا نام ''لٹ خانہ تحریک'' پڑا۔ یہ بلوچستان میں ترقی پسندی اور روشن خیالی کی تحریک تھی۔

کمال خان شیرانی اس تحریک کا دانش ور لیڈر بنا۔

گلی میں آس پاس کے لوگ نائب تحصیل داروں اور تحصیل داروں کی حرکات سے حیران ہوتے تھے۔ وہ صبح تو ٹائی لگا کر تھری پیس سوٹ میں نکلتے مگر واپس آ کر سہ پہر اور شام کو بوریوں میں گھاس اور مٹی ڈھوتے۔ وہ اپنے لٹ خانے کو خوب صورت جو بنا رہے تھے۔ اس میں ایک چمن لگا رہے تھے، انگوروں کی بیلیں اور پھول اگا رہے تھے۔

لٹ خانہ میں درجنوں لوگ آتے۔ گفتگو میں شریک ہوتے۔ اور کام کی باتیں ساتھ لے جاتے۔

یہاں ان کو ایک اور بہت اچھا ساتھی اور کامریڈ ملا۔ وہ انہی کی گلی میں رہتا تھا۔ دن بھر جا کر روزانہ اجرت پر کام ڈھونڈتا اور شام کو لوٹتا۔ اس سے اُن لوگوں کی شناسائی ہوئی، انہیں اس کی اور اس کو اُن کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ وہ رات کو اُن کے یہاں آتا اور اپنی دلچسپ سرگزشت سناتا۔ وہ اصل میں کچلاک کا رہنے والا سنئیا کاکڑ تھا۔ چرس کا دم بھی لگاتا تھا اور رات کو انتہائی روانی سے اپنے حالات زندگی بیان کرتا۔ اس کی باتیں سن کر وہ لوگ محو ہو جاتے۔ ان لوگوں کو کسی غریب مزدور اور ایک عام انسان کی زندگی اس قدر قریب سے کبھی بھی نظر نہیں آئی تھی۔ اس شخص کا نام محمد غوث تھا۔ وہ سندھ میں جس طرح خرکاروں کے دام میں پھنس گیا تھا اور جو مظالم اس نے سہے تھے اور خرکاروں کے کیمپ میں مزدوروں سے جس طرح ٹھیکیدار اور اس کے ایجنٹ سلوک کرتے تھے، محمد غوث ان تمام واقعات اور حالات کو اس طرح تفصیل سے بیان کرتا تھا کہ یہ لوگ اس کی ذہانت اور فن کارانہ صلاحیت پہ حیران رہ جاتے۔ یہ سلسلہ کئی راتوں تک جاری رہتا۔ اور اس طرح کمال خان نے محمد غوث کے بیان کا نام ''بنڈل بیان'' رکھ دیا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل ہمارے اس بزرگ محمد غوث کا انتقال ہو گیا۔

لٹ خانہ نامی اس مکان میں سماجی، معاشی، سیاسی اور نظریاتی مسائل پر بحث مباحثے ہوتے اور یہیں پہ تحریک کے داؤ پیچ اور حکمت عملی کے بارے میں فیصلے کیے جاتے۔ محدود پیمانے پر پمفلٹ اور مطبوعات بھی چھاپی جاتیں۔ یہ لوگ بہت زندہ دل تھے۔ ہر بات میں مزاح کا پہلو نکالتے تھے۔ یہاں کوئی ''لٹ اعظم'' کہلاتا تھا تو کوئی ''بنڈل بیان'' کا خطاب پاتا۔ اس طرح کے

کئی الفاظ، کئی فقرے موجود ہیں۔ مگر کیا کریں۔ لکھنے میں، اور خصوصاً اردو لکھنے میں ممانعتیں بہت ہیں۔ المختصر، انقلاب جیسے ذمہ دار کام کو ذمہ داری سے کرنے کے باوجود یہ لوگ اپنی خوش طبعی پہ کوئی مصالحت نہ کرتے تھے۔

لٹ خانہ بہت جلد ایک ٹھوس مادہ یعنی مکان کے بجائے ایک تصور کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ لٹ خانہ ایک طرح کا بحث خانہ تھا۔ یہ ایک مطالعہ گاہ بھی تھی۔ اتالیق کامل القادری نے یہاں سٹڈی سرکل شروع کیا۔ یہیں پہ ان لوگوں نے مشہورِ زمانہ کتاب ''کمیونسٹ مینی فیسٹو'' باجماعت پڑھی۔

لٹ خانہ سیاسی معاشی تجزیہ گاہ بھی تھا اور متبادل سوچنے اور ایک تھنک ٹینک جیسا ادارہ کھڑے کرنے کی منصوبہ گاہ بھی۔ جب یہ مرحلہ پورا ہوا تو پھر وہیں سے پمفلٹ نکلنے شروع ہوئے، اور کتابچے چھپنے شروع ہوئے۔ وہیں سے ''بلوچی زبان وادبئے دیوان'' نامی ادبی تنظیم، لٹ خانہ کا اگلا ارتقائی مرحلہ بنی۔ لٹ خانہ کے اِن بڑے انسانوں نے پھر ''فی الحال سٹیشنری مارٹ'' کے نام سے روشن فکری کی کتابوں کی ایک دکان کھولی۔ لٹ خانہ ہی سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا گیا۔ بعد کا ارتقائی دور تو بالخصوص اہم تھا کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد اُس مرکزی ہیڈ کوارٹر سے یہ لوگ اپنے اپنے آبائی علاقوں میں عوامی سیاسی کمیٹیاں بنانے جاتے رہے۔ ژوب میں کمیٹی بنی، اسپلنجی میں بنی اور نوشکی میں بنی۔

واضح رہے کہ لٹ خانہ کی سوچ کے عین مطابق، عبداللہ جان نے ہجوم کی سیاست کبھی نہیں کی۔ وہ تو ہجوم کو جگانے اور ہجوم کو منظم کرنے والی روحوں کی تلاش کی سیاست کرتا رہا۔ اور اُس سیاست کے لیے اُسی طرح کی ایک سیاسی پارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسی سیاسی پارٹی جو موت کے سکوت میں پتھر مارتے رہنے کے لیے مامور ہو۔ ایسی پارٹی جو دلوں روحوں کو آزاد کرے، جو کوہِ ماران کے ریوڑوں کی گھنٹیوں کی ژولیدگی کو موسیقیت عطا کرے۔

فی الحال سٹیشنری مارٹ

کوئٹہ میں کاروباری لوگ زیادہ تر ہندو اور سکھ ہوا کرتے تھے۔ اُن کے چلے جانے سے دکانیں خالی ہوگئی تھیں۔ پنجابی اور پشتون کا روباری لوگوں نے ان دکانوں پر قبضہ جمالیا تھا۔ عبدالحلیم نامی ایک شخص نے ان لٹ لوگوں کو اپنی قریب کی دو کانوں پر قبضہ کرنے کے لیے کہا۔ چنانچہ انھوں نے آسانی سے محکمہ متروک جائیداد سے انہیں الاٹ کروالیا۔ دن بھر وہ ان دو میں سے ایک دوکان کو سنوارنے میں مصروف رہتے اور رات کو اپنے ٹھکانے پہنچ کر نئی زندگی کے بارے میں پروگرام بناتے۔

ایک رات یہ فیصلہ ہوا کہ ایک دکان میں سردست یعنی ''فی الحال'' ایک سٹیشنری کی دکان لگائی جائے۔ ''فی الحال'' سٹیشنری خرید کر اس میں رکھیں گے۔ ''فی الحال'' سکول کی کاپیاں، تختیاں، قلم پنسل وغیرہ وغیرہ۔ اِس بار بار لفظ ''فی الحال'' کی تکرار نے ان کے لیے دکان کا نام رکھنے کا مسئلہ آسان کر دیا۔ کیوں کہ وہ ہر وقت سوچتے رہتے تھے کہ آخر اس سٹیشنری مارٹ کا کوئی نام بھی تو ہو۔ جب وہ کچھ بھی طے نہ کر سکے تو بالآخر کمال خان نے سارا دن لفظ ''فی الحال'' کے دھرائے جانے کی مناسبت سے تجویز کی کہ اس کا نام ''فی الحال سٹیشنری مارٹ'' رکھا جائے۔ چنانچہ دکان کا نام ''فی الحال سٹیشنری مارٹ'' پڑ گیا۔ (کون کہتا ہے کہ مارکسزم ایشیا کا، بلوچستان کا اور کوئٹہ کا نہیں ہے!)

موجودہ زمانے میں بلوچستان میں ڈاکٹر جمال مری نامی ہمارے ایک پیسے والے دوست نے اسی ''فی الحال سٹیشنری مارٹ'' کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے ''فی الحال پیٹرول پمپ'' (کوہلو، سبی اور کوئٹہ میں)، ''فی الحال میڈیکل سٹور''، ''فی الحال آٹوز'' اور ''فی الحال گفٹ سینٹر'' قائم کیے۔

فی الحال سٹیشنری مارٹ میں زیادہ تر تو سکول کی کاپیاں کتابیں تھیں۔ مگر چوں کہ یہ سب لوگ انقلابی تھے۔ اس لیے وہ انقلابی کتابیں بھی بیچنے لگے۔ ان کی کتب فروشی کی خبر دور دراز کے شہروں میں رہنے والے ان کے دوستوں تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ کراچی اور لاہور کے انقلابیوں نے اُن کے لیے بڑی دلچسپ اور نایاب کتابیں بھجوادیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر تو اردو میں تھیں مگر انگریزی میں بھی بہت ساری کتابیں تھیں۔ ایسی کتابیں زیادہ تر ملک کے مشہور دارالاشاعت، پیپلز پبلشنگ ہاؤس لاہور سے آتی تھیں۔

کوئٹہ میں یہ گویا ایک نئی بات تھی۔ لوگ شروع شروع میں الماریوں کے اندر جب اُن کتابوں کو دیکھتے اور ان کی پشت پر لینن، سٹالن، مارکس اور اینگلز کے نام دیکھ لیتے تو چونک جاتے۔ مگر آہستہ آہستہ لوگوں نے دلچسپی لینی شروع کی۔ اور پورے شہر میں یہ ایک اہم اور بڑی خبر بنی کہ فی الحال سٹیشنری مارٹ میں مارکسسٹ لٹریچر فروخت ہو رہا ہے۔

لٹ خانہ میں جو نادر کتابیں اُن لوگوں نے اپنے پڑھنے کے لیے علیحدہ کیں، وہ ان کے لیے نویدِ فکر ثابت ہوئیں۔ ایک ایک کر کے ہر کتاب ان کے زیرِ مطالعہ رہتی۔ علم کے پیاسوں کو اچانک شیریں آب کے ٹھنڈے چشمے ملیں تو وہ کیا کیا سیرابیاں نہ کرتے ہوں گے: ''گناہ اور سائنس''، ''انسان کا عروج''، ''سماج کا ارتقا''، ''خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز''۔

ماما لکھتا ہے کہ:

''فی الحال سٹیشنری مارٹ'' کو سجانے میں خدائیداد نے بڑی کوشش کی تھی۔ خدائیداد بہت اچھے آرٹسٹ اور خطاط تھے۔''(1)

سائیں کمال خان شیرانی بتاتا ہے کہ خدائیداد نے سرخ کپڑے پر سلور رنگ میں ''فی الحال سٹیشنری مارٹ'' لکھ کر لٹکایا۔ اسی طرح خدائیداد نے گاہکوں سے کاروبار کرنے کے سٹینڈ کے

پیچھے بہت ہی خوب صورت خط میں نظیری کے مشہور فارسی اشعار لکھ دیے تھے۔ جس سے ان کی باغیانہ فکر کی غمازی ہوتی ہے:

گریز از صفِ ماہر کہ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلہِ مانیست

انہی اشعار سے علامہ اقبال نے متاثر ہوکر کہا تھا:

بہ ملک جم نہ دہم مصرعِ نظیری را
''کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلہ مانیست''

مگر یہی وہ بدقسمت مصرع ہے جسے بعد میں بلوچستان کے روایتی بالائی طبقے نے خوب استعمال کیا۔ سرداروں کے دانش وروں نے ان سرداروں کے ذاتی مفادات وعزائم کو ہمیشہ ایک منصفانہ سماج کے قیام کا منشور بنا کر پیش کیا۔ اور ایسے اشعار کو ان کے ذاتی مفادات کا خدمت گزار بنادیا۔

اس مرحلے پر ایک اور ممتاز دانش ور، کامل القادری ان سے آن ملتے ہیں۔ وہ بلوچستان اور دیگر علاقوں کے کمیونسٹوں کے بیچ سفیر بن جاتے ہیں اور پوری زندگی اچھے انسانوں کو جوڑتے رہنے کا کام کرتے رہے۔ کامل نے کمیونسٹ پارٹی کی ملکیت میں چلنے والی کتابوں کی بڑی دکان یعنی ''پیپلز پبلشنگ ہاؤس'' لاہور سے سوشلسٹ لٹریچر کا ایک بڑا ذخیرہ حاصل کیا۔ لاہور اس زمانے میں ترقی پسند ادیبوں کا گڑھ ہوا کرتا تھا۔ اس وقت دادا فیروز الدین منصور زندہ تھے۔ ان کی کتابیں لٹ خانہ میں مقبول تھیں۔ لہٰذا ان کی تصانیف یعنی ''مودودیات'' اور ''پاکستان میں قومیتوں کا مسئلہ''، ان سب دوستوں نے پڑھ ڈالیں۔ اہالیانِ لٹ خانہ ان کے ترقی پسندانہ خیالات سے بے حد متاثر ہوئے۔ یہ لوگ روزنامہ 'امروز' اور سبط حسن صاحب کا ہفت روزہ 'لیل ونہار' بھی باقاعدگی سے پڑھتے۔ 'پاکستان ٹائمز' بھی پڑھنے کو ملتا۔ اُن دنوں لاہور سے ایک مشہور ادبی مجلّہ 'سویرا' چھپتا تھا۔ یہ مجلّہ اردو کے ترقی پسند ادیبوں کا تھا، لہٰذا لٹ خانے والے اسے خریدتے اور بہت دلچسپی سے پڑھتے۔ یہ لوگ افسانے کی دنیا کے بڑے ستاروں یعنی فکر تونسوی، کنیالال کپور، عصمت چغتائی،

سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، ابراہیم جلیس، احمد عباس اور ملک راج آنند کے افسانے بھی بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اردو کے شاعروں میں فیض صاحب سرفہرست تھے۔ اس کے علاوہ احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، اسرار الحق مجاز، اور ظہیر کاشمیری خوب پڑھے جاتے۔

عبداللہ جان نے لٹ خانہ میں بہت سے مشہور ناول پڑھے: ایک ملک دو کہانی۔ چالیس کروڑ بھکاری۔ جیل کے دن جیل کی راتیں۔ کال کوٹھڑی، سیفٹی ریزر، وغیرہ (2)۔ اس طرح لٹ خانہ والے بھرپور انداز میں پروگریسو لٹریچر کا مطالعہ کررہے تھے اور اس لٹریچر کو وسیع پیمانے پر تقسیم بھی کررہے تھے۔ پمفلٹ بازی، لیکچر بازی اور بحث مباحثے خوب چل رہے تھے۔

اُدھر بیوروکریسی جوان کی ملازمتیں چھوڑ دینے کی وجہ سے پہلے ہی ناراض تھی۔ ان کی ان سرگرمیوں سے مزید بپھرتی گئی۔ پاکستانی سرکار کو ''اللہ لوک'' ہستیوں سے اللہ واسطے کا بیر رہا ہے۔ نہ کل سُدھرے نہ آج عقل آئی۔ بالآخر حاکموں نے ''فی الحال'' پر چھاپہ مارا، ساری کتابیں ضبط کرلیں، اسے سیل کردیا اور لٹوں کو ''کمیونسٹ'' قرار دیا۔ (کمیونسٹ اُس زمانے میں ایڈز کے مریض سے بھی زیادہ خطرناک سمجھے جاتے ہیں۔ پاکستانی میکارتھیوں نے کتنی لطافتیں، کثافتیں بنا ڈالیں!!)

عبداللہ جان کے بڑے بھائی آزاد جمالدینی بھی کچھ عرصہ بعد آکر لٹ خانہ میں شامل ہوئے تھے۔ یہیں وہ انجم قزلباش اور عین سلام سے واقف ہوئے۔ آزاد نے تو شاعری بھی یہیں شروع کردی۔ ان کی کتاب ''مستیں توار'' بھی یہیں لٹ خانہ میں شائع ہوئی۔ یہیں انہوں نے لٹ خانہ والوں کی ہم راہی میں ٹالسٹائی، پوشکن، چیخوف اور دوستوئفسکی کی تقریباً تمام تصانیف کا مطالعہ کرلیا۔

اس دوران سید کامل القادری کراچی اور لاہور کے اپنے دوروں کے دوران لٹ خانہ کی سفارت کے فرائض خوب انجام دیتے رہے۔ اس اچھے انسان کی بدولت کراچی اور لاہور کے ترقی پسند حلقوں میں لٹ خانہ کی خوب جان پہچان ہوئی۔ دانش وروں سے اہل لٹ خانہ کا تعارف ہوا۔ ان دنوں پاکستان کے ادبی حلقوں میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا خوب چرچا تھا۔ ہر جگہ تحریک

کی شاخیں قائم ہورہی تھیں۔اورنوجوان ادیب،شاعراوردانش وراس تحریک میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔

ماماعبداللہ جان کو یہ تو یاد نہیں کہ آیا کراچی اور لاہور کے ترقی پسند دانش وروں نے مشورہ دیا تھا کہ کوئٹہ میں ترقی پسند ادبی تحریک کی شاخ قائم کی جائے یا پھر اُن سے متاثر ہوکر لٹ خانہ والوں نے ازخود تحریک کی شاخ قائم کرنے کی ٹھان لی۔بہرحال انہیں اتنا یاد ہے کہ ایک روز لٹ خانہ میں سید کامل القادری نے دوستوں کو عبد السلام شاہ (عین سلام) کے یہاں جانے کو کہا۔جمالدینی اور کمال خان ان کے ساتھ چلے گئے۔وہاں رفیق راز،عین سلام،عابد شاہ،وغیرہ پہلے سے موجود تھے۔یہ گویا ترقی پسند ادیبوں کی پہلی نشست تھی جس میں عبداللہ جان اور خدائیداد نے شرکت کی۔اس طرح سے کوئٹہ میں ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم ہوئی۔

چنانچہ عبداللہ جان کی مصروفیات ادبی میدان میں تیز اور نمایاں ہوتی گئیں۔ادبی تحریکوں سے آشنائی ہوتی گئی،ادب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا گیا اور ادبی شخصیات سے ملنا جلنا زیادہ ہوا۔اس زمانے میں بلوچستان کے اندر گل خان نصیر اردو کے مشہور شاعر اور ادیب سمجھے جاتے تھے۔وہ سٹینڈرڈ ہوٹل واقع مشن روڈ میں قیام رکھتے تھے۔غلام محمد شاہوانی اُن دنوں ''نوائے بلوچستان'' کے مدیر تھے۔عبداللہ جان ان سے ملنے جایا کرتے تھے۔اس طرح سٹینڈرڈ ہوٹل میں اکثر گل خان نصیر اور غلام محمد شاہوانڑیں سے ادبی گفتگو ہوتی تھی۔سٹینڈرڈ ہوٹل ہی میں انکی ملاقات میر غوث بخش بزنجو،ملک فیض محمد یوسف زئی،ملک عبدالرحیم خواجہ خیل اور عبدالکریم شورش سے بھی ہوتی۔

عبداللہ جان اپنی مادری قومی زبان،بلوچی کے علاوہ پشتو میں بھی لکھتے ہیں اور بہت خوب لکھتے ہیں۔پشتو سے ان کی یاری بہت دلچسپ ہے۔لٹ خانے میں ڈاکٹر خدائیداد کے پاس پشتو کی کتابیں تھیں۔ماما نے ان کا بھی مطالعہ شروع کیا۔ویسے تو وہ طالب علمی کے زمانے میں اسلامیہ کالج پشاور میں پڑھے جہاں طلبا کی اکثریت پشتو بولنے والوں کی تھی۔وہیں وہ سائیں کمال خان کی وجہ سے اکثر پشتو پڑھتے۔مگر اس وقت پشتو میں صرف چند کتابیں دستیاب تھیں۔ماما نے وہ

پڑھ ڈالیں۔بالخصوص ممتاز محقق و تاریخ دان پروفیسر عبدالحئ حبیبی اور گل محمد نوری کو انہوں نے بہت دلچسپی سے پڑھا۔اس طرح پشتو ادب سے عبداللہ جان کی بھرپور شناسائی ہوئی اور وہ پشتو ادبی تاریخ اور ادبی شخصیات سے آگاہ ہوگئے۔

حوالہ

1۔جمالدینی،ع۔ج۔لٹ خانہ۔صفحہ 23

2۔جمالدینی،لٹ خانہ۔صفحہ 78

بلوچی زبان وادب ئے دیوان

پشتو کی ان گراں مایہ کتابوں نے ،اور پھر کمال خان اور خدائیداد کے پشتو سے لگاؤ نے عبداللہ جان میں ایک جذبہ پیدا کیا کہ وہ خود بلوچی میں لکھنا شروع کردے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ بلوچی میں لکھنے کا یہ اس کا اولین تجربہ تھا۔

اسی دوران جب وہ تین چار روز کے لیے گاؤں گیا تو وہاں اس کا ایک بوڑھا رشتہ دار تھا جو اکثر بلوچی کی قدیم شاعری سنایا کرتا تھا۔ اس کا نام تھانا کو (چچا) غوث بخش۔ ماما نے ناکو سے مدعا بیان کیا کہ وہ بلوچی اشعار کو اکٹھا کرنا چاہتا ہے۔ وہ بہت خوش ہوا اور فوراً اس کی مدد کے لیے آمادہ ہوا۔ اس طرح جمالدینی صاحب نے بلوچی اشعار کو تحریری صورت دینے کا کام شروع کیا۔ پہلی نظم جو اس نے ناکو غوث بخش سے حاصل کی وہ حانی شئے مرید کی داستانِ عشق سے متعلق تھی۔

یوں زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اپنی کلاسیکی شاعری کا پتہ چلا اور اس کی خوب صورتی اور گہرائی کا اندازہ ہوا۔

انہی دنوں پشتو اور اردو ادب کی دیگر کتابوں کے مطالعہ کے علاوہ اس کے ہاتھ میکسم گورکی کی چند کتابیں آئیں۔ اس نے ان کا مطالعہ شروع کیا۔ یہ کتابیں انگریزی میں تھیں۔ گورکی تو ذہن کلٹی کردیتا ہے۔ یہیں پر اسے ٹالسٹائی، پوشکن، چیخوف، اور دوستوئفسکی جیسے عظیم ادیبوں کی

تصانیف ملیں اور اس نے ان کی تقریباً ساری کتابیں پڑھ ڈالیں۔

اسی دوران، لٹ خانہ والوں کو ایک خیال یہ سوجھا کہ پشتو اور بلوچی ادیبوں کو یک جا کر کے ان کی ایک تنظیم بنادی جائے۔ اس پر بہت غور اور مباحثہ ہوا۔ چنانچہ خدائیداد نے پہل کی اور پشتو ادیبوں کی ایک نشست منعقد کروائی جس میں طے ہوا کہ ''پشتو ٹولی'' کے نام سے پشتو کے ادیبوں کو منظّم کیا جائے اور اس طرح سے پشتو ادب اور شاعری کو فروغ دیا جائے۔

یہی کچھ بلوچی زبان کے ادیبوں نے کیا۔ لٹ خانہ کے اسی فیصلے کے تحت 1950 (یا 1951) میں ایک شام گل خان نصیر کے کمرے کے آگے برآمدے میں چند ہم فکر لوگوں اور نوجوانوں کی میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں طے کیا گیا کہ ''بلوچی زبان وادب ئے دیوان'' کے نام سے ایک انجمن بنائی جائے۔ یہ انجمن قائم ہوگئی اور اس کے انتخابات ہوئے۔ دیوان کا صدر ظاہر ہے گل خان نصیر ہی کو ہونا تھا۔ نائب صدر غلام محمد شاہوانڑیں بنا اور جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے عبداللہ جان کو منتخب کیا گیا۔ اس تنظیم کا پریس سیکرٹری جناب عبدالکریم شورش ہوا، خزانچی جناب قاضی غلام محی الدین اور جوائنٹ سیکرٹری انور عالیانی بن گیا۔ (1)

ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ انجمن کے لیے ایک دفتر لے کر اس میں باقاعدہ کام شروع کردیا جائے۔ چنانچہ غلام جان کی کوششوں سے فاطمہ جناح روڈ پر ایک کمرہ ملا۔ کرایہ دس روپیہ ماہوار تھا۔ اسے انجمن کا دفتر بنایا گیا۔ ہر روز صبح ماما اور غلام محمد شاہوانڑیں دفتر کھولتے، اس میں بیٹھتے اور کام کرتے۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ حانی شئے مرید سے متعلق بلوچی نظمیں یک جا کرنا شروع کردیں۔

ان دوستوں کے طفیل 1952ء کا سال بلوچی ادب کی تاریخ میں بہت اہم ثابت ہوا۔ گل خان نصیر نے بالآخر اپنا بلوچی کلام یک جا کر کے کتابت کے لیے دے دیا۔ اس کی کتاب ''گل بانگ'' اسی برس شائع ہوئی۔ یہ کتاب ''بلوچی زبان وادب ئے دیوان'' ہی کی طرف سے شائع ہوئی۔ میر گل خان نصیر کی اس کتاب میں ماما نے بڑی دلچسپی لی اور اسے فروخت کرنے کے لیے ان تھک کوشش کی۔ کتاب کی قیمت 2 روپیہ تھی۔ مگر اس کم قیمت پر بھی کوئی خریدنے والا نہ تھا۔ آخر مجبور

ہوکر گل خان نصیر کی ہدایت پر اسے مفت تقسیم کرنا پڑا۔

''گل بانگ'' بلوچی زبان کے سب سے بڑے شاعر گل خان نصیر کا پہلا شعری مجموعہ ہونے کے علاوہ بلوچی شاعری اور ادب کی بھی سب سے پہلی کتاب تھی۔ ظاہر ہے اس کتاب کی اشاعت میں بھی ''فکرِ لٹ خانہ'' کا بہت بڑا دخل تھا۔ کتاب کی کئی کاپیاں ایران اور افغانستان کے بلوچ علاقوں میں بھیج دی گئیں۔ اس طرح ان ممالک کے تعلیم یافتہ بلوچوں کو بلوچی ادب کی طرف متوجہ کیا گیا۔ آج کئی ایرانی اور افغانی بلوچ ادیب اس کتاب کے مرہونِ منت ہیں کہ انہوں نے اسی کی بدولت بلوچی میں لکھنا پڑھنا شروع کیا تھا۔

لٹ خانہ نے دنیا بھر کے بلوچوں کو متاثر کیا اور پڑوسی ممالک میں بلوچی کے کئی مشہور ادیب بنے۔

حوالہ

1۔ جمالدینی۔ لٹ خانہ۔ صفحہ 67

رومانٹک کمیونسٹ

ایک طرف اسلامیہ کالج پشاور میں صاحبزادہ ادریس کی شاگردی تھی، پٹ فیڈر میں کسانوں پہ ہونے والے مظالم کا مشاہدہ کیا، بڑے پیمانے پر ترقی پسند لٹریچر کا مطالعہ کیا، اور ممتاز کمیونسٹ شخصیات سے شناسائی ہوئی۔ ان سب نے میر عبداللہ جان اور اس کے دوستوں کی سوچ پہ گہرے اثرات چھوڑے۔ وہ موجود استحصالی نظام کو تمام برائیوں کی جڑ سمجھنے لگے اور ایک منصفانہ سماج کے قیام کی ضرورت کو محسوس کرنے لگے۔ ان کی باتوں، بحثوں اور سرگرمیوں کا محور سوشلسٹ انقلاب بننے لگا۔

سٹینڈرڈ ہوٹل میں گل خان نصیر اور اس کے سیاسی رفقا کے علاوہ غلام محمد شاہوانڑیں اور ملک پناہ بھی اکثر ملتے۔ جب میر غوث بخش بزنجو کوئٹہ آتے تو اکثر گل خان کے ساتھ سٹینڈرڈ ہوٹل میں قیام کرتا۔ لٹ خانہ کے دوست بیشتر وقت اس کی صحبت سے استفادہ کرتے۔

بزنجو صاحب کمیونسٹ پارٹی میں رہا تھا۔ اور اس کا ترقی پسندوں سے گہرا تعلق تھا۔ اور لٹ خانہ والے بھی اسے اپنا ہم خیال سمجھتے تھے۔ وہ اکثر لٹ خانہ بھی آتا تھا۔ شورش بابو تو سٹینڈرڈ ہوٹل اور لٹ خانہ میں روزانہ جاتا۔ شورش بابو کا تعلق پہلے ہی سے کوئٹہ کے پرانے کمیونسٹوں سے رہا تھا۔ یوں: صحبت صالح ترا صالح کند، کے مصداق ماما عبداللہ جان کلٹی ہو گیا۔ وہ

خودکو مارکسسٹ کہلانے لگا۔

لٹ خانہ میں عبداللہ جان، خدائیداد، اور کامل القادری یک جا تھے۔ چنانچہ کامل نے ان کا سٹڈی سرکل لینا شروع کیا۔ اور مارکس و اینگلز کی کتاب ''کمیونسٹ مینی فسٹو'' انھیں پڑھ کر سنانا شروع کی۔ وہ لوگ ہر نشست میں اس کتاب سے ایک دو صفحات پڑھتے، ان پر بحث کرتے اور اس کے حوالے سے ملکی و بین الاقوامی امور کو دیکھنے لگتے۔ اس کتاب، اور دیگر ترقی پسند ادب نے ان لوگوں کے ذہن یکسر بدل ڈالے۔

زندگی کے حقائق رفتہ رفتہ ماما کے آگے واضح ہوتے جا رہے تھے۔ یہیں اسے پتہ چلا کہ عقائد، زبانیں، اور طبقات کس طرح تشکیل پاتے ہیں۔ اسے اپنے وطن میں سماجی نابرابری کی اصل وجوہات معلوم ہونے لگیں۔

ان لوگوں نے سماج کے ان تمام مسائل کا حل سوشلزم میں دیکھا۔ گویا فکری طور پر وہ سوشلسٹ ہو گئے۔ یہ نتیجہ تھا مطالعہ کا۔ ترقی پسند ادب اور مارکسسٹ لٹریچر کے مطالعہ نے انھیں اس نظریہ کو قبول کرنے میں مدد دی۔ اب نہ صرف یہ کہ وہ خود کمیونسٹ بنے بلکہ ان لوگوں کے توسط سے بلوچستان کے اندر نوجوانوں، طالب علموں اور لوگوں میں بھی یہ فکر پھیلنے لگی۔

ایک غیر واضح، مدہم سا تصور جس میں سماج سدھار ہو، غربت کا خاتمہ ہو، تعلیم عام ہو اور جاگیرداری کا خاتمہ ہو۔ ایک سادہ، غیر پیچیدہ اور آسانی سے قابلِ حصول انقلاب..... ماما کا کمیونزم ہو بہو وہی تھا جو اِس عمر کے نوجوانوں میں ہوا کرتا ہے۔ کچھ کچھ ادبی، کچھ کچھ جذباتی، کچھ کچھ رومانٹک.....

صحافت

اس وقت تک عبداللہ جان صحافی بھی بن چکا تھا۔ وہ اخبار ''نوائے بلوچستان'' میں گل خان نصیر کا مدیر معاون تھا۔ اخبار کے مالک زہری برادران تھے، یعنی میر نبی بخش زہری، میر قادر بخش، اور میر امام بخش۔ میر نبی بخش خود مسلم لیگی تھا۔ کوئلہ کانوں، تجارت، وسیع کاروبار اور سیاست کی وجہ سے اخبار اُس کی ضرورت تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایڈیٹر اس نے گل خان نصیر کو منتخب کیا تھا۔ عبدالکریم شورش (شورش بابو) بھی ان دنوں زہری برادران کے مائننگ ادارہ میں منشی (کلرک) تھا۔ ملک محمد پناہ چاغی ٹرنسپورٹ کمپنی میں تھا اور بابو محمد پناہ کہلاتا تھا۔

اصل میں میر غوث بخش بزنجو نے عبداللہ جان کو میر گل خان نصیر کی زیرادارت چلنے والے اس اخبار یعنی ''نوائے بلوچستان'' سے وابستہ کروادیا۔ کیوں کہ ''فی الحال سٹیشنری مارٹ'' کی مختصر زندگی ختم ہو چکی تھی۔

اِدھر جب خان احمد یار خان کو مسلم لیگ سے پھر قربت کا شوق چڑھا تو اس نے چاہا کہ ریاست بھر میں مسلم لیگ کو منظّم کیا جائے۔ (بادشاہوں کے شوق بھی عجیب ہوتے ہیں!!)۔ چنانچہ اس نے میر بزنجو اور گل خان نصیر سے رابطہ کیا۔ اور انھیں اس ''نیک'' کام پہ راضی کر لیا۔ میر غوث بخش بزنجو اس ''ہر دلعزیز'' اور ''عوامی'' پارٹی کا کنوینر بنا۔ اس نے عبداللہ جان، غلام محمد شاہوانی

اور بہادر خان بنگلزئی کو بھی اس میں شمولیت کے لیے منوالیا۔ چنانچہ دوستی، مروت اور ''شاید کچھ بہتری آئے'' کی امید کے ساتھ ماما بھی اس ''کارِخیر'' میں ساتھ ہولیا۔ اپنی روایتی محنت کے ساتھ اس نے ڈھاڈر، مستنگ اور قلات میں اس کے جلسے کروائے۔ یہ 1952 کے اواخر کے ماہ تھے۔

مگر کچھ عرصہ بعد عبداللہ جان اور اس کے ساتھیوں کو اندازہ ہوا کہ اس لسی میں سے کوئی مکھن نہیں نکلنے والا۔ لہٰذا بہت ایمان داری اور قطعیت کے ساتھ انھوں نے میر بزنجو کی اس لائن سے بغاوت کردی۔ وہ اپنی پرانی ڈگر پہ چل پڑے اور ترقی پسند تحریک کے کام میں جت گئے۔

میر عبداللہ جان کی سیاسی سوانح میں ایک اور موڑ بھی اہم تھا۔ 1953 میں سندھ اسمبلی کے الیکشن ہوئے۔ ان انتخابات میں ہاری پارٹی نے بھی اپنے امیدوار کھڑے کردیے۔ ہاری پارٹی کی طرف سے برکت علی آزاد امیدوار تھا۔ عبداللہ جان اپنے ساتھیوں سمیت اس کے الیکشن مہم میں شامل ہوگیا اور یہ پوری مہم تقریباً انہی لوگوں نے چلائی۔ ہاری پارٹی جیسی جماعتوں کے امیدواروں کی ہار جیت کا فیصلہ، البتہ، ازل سے آج تک اُسی مقدر کے ہاتھوں میں رہا جسے بدترین دقیانوسی نظام کو دوام دینے والی ایجنسیاں چلاتی ہیں۔

یہی سال یعنی 1953 اپنی اہمیت میں لٹ خانہ کے لیے کچھ کم نہ تھا۔ اس سال پشتو زبان کے مشہور مجلّہ ''پشتو'' کی اشاعت شروع ہوئی (1)۔ لٹ خانہ اس رسالے کی جائے پیدائش تھی۔ لٹ خانے والوں کے ارادوں کی پختگی دیکھیے کہ جب بلوچی کے مجلّہ ''سوب'' کے اجرا کی درخواست کو رد کیا گیا تھا تو یہ لوگ خاموش ہوکر بیٹھ نہیں گئے بلکہ انہوں نے ایک پشتو رسالے کی درخواست دینے کا فیصلہ کیا۔ چوں کہ ''سوب'' کا تجربہ اس بارے میں یہ ہوا تھا کہ لٹ خانہ میں موجود ساتھیوں میں سے کسی کے نام سے ڈیکلریشن ملنا مشکل ہوگا اور اس کی درخواست رد کردی جائے گی۔ اس لیے کہ سی آئی ڈی کی رپورٹیں سب کے حق میں اچھی نہ تھیں۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ چوں کہ کمال خان شیرانی اکثر لٹ خانہ سے باہر اپنے علاقہ میں ہوتا تھا۔ لہٰذا اس کے نام سے اجازت ملنے کا امکان موجود تھا۔ چنانچہ کمال خان شیرانی کے نام سے ڈیکلریشن کے لیے درخواست دے دی گئی۔ پانچ چھ ماہ کے بعد ''پشتو'' ماہنامہ کا ڈیکلریشن حاصل ہوگیا۔ اور اسے شائع کرنے کا اہتمام کیا گیا۔

اُدھر اُسی برس یعنی 1953 ہی میں میر بزنجو صاحب نے یہ خوش خبری سنادی کہ:

''نوائے وطن'' کی ڈیکلریشن کے لیے جو درخواست غلام محمد شاہوانڑیں نے دی تھی، اس کی اشاعت کی اجازت اسے مل گئی ہے۔ مگر شاہوانڑیں صاحب خود چوں کہ روزنامہ ''اتحاد'' کا نیوز ایڈیٹر ہے اس لیے یہ کام وہ خود نہیں کرسکتا۔ لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ ''نوائے وطن'' کی ادارت میر گل خان نصیر کرے اور عبداللہ جان اس کی معاونت کرے۔

ماما نے لبیک ہی کہنا تھا، کہہ دیا۔

چنانچہ جون 1953 میں ''نوائے وطن'' کا پہلا شمارہ گل خان نصیر کی ادارت میں کوئٹہ سے شائع ہوا۔ عبداللہ جان بدستور اُس کا (جیسا کہ نوائے بلوچستان کے دور میں تھا) معاون مدیر تھا۔ اس اخبار کی پالیسی نسبتاً آزاد تھی۔ قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کی فکر اور نظریات کی پیروی، آزاد خیال نیشنلسٹوں کی پالیسی، بائیں بازو کی جانب رجحان..... پھر گل خان نصیر چوں کہ خود صحافی کے علاوہ ادیب اور شاعر بھی تھا، اس لیے اخبار میں ادبی مواد اور خبریں بھی اچھی خاصی ہوتیں۔ المختصر، یہ مکمل طور پر ایک عوامی پرچہ تھا۔

''نوائے وطن'' کی ادارت سے منسلک ہونے کی وجہ سے اس اخبار میں مصروفیت کے علاوہ عبداللہ جان کی دلچسپی ماہنامہ ''پشتو'' میں بھی تھی۔ پشتو زبان وادب کے ساتھ، ادبی ذوق وشوق کی وجہ سے وہ پہلے ہی وابستہ تھا۔ اور اب یہ وابستگی اور بڑھی۔

ماما تو بچپن سے پشتو زبان سے بلد چلے آرہا تھا۔ اور اس کے بعد ماما اور سائیں کی گہری دوستی نے ماما کو پشتو کے بہت قریب کردیا، پھر وہ پشاور مزید تعلیم کے لیے گیا۔ وہاں چار سال مزید پشتو ہی بولتا رہا۔ تعلیم کے بعد تو ماما اور کمال خان ملازمت کے دوران اور پھر ملازمت سے مستعفی ہوکر بھی ساتھ رہے۔ اور خدائیداد بھی ساتھ رہا۔ اس طرح پشتو گویا اس کی دوسری زبان بن گئی۔

پشاور میں کالج کی تعلیم کے دوران پشتو ادب سے اس کی خوب شناسائی ہوئی۔ سب سے پہلے جو کتاب اس نے دیکھی وہ عبداللہ جان اسیر کی تھی۔ اس کا نام تھا ''دوینو جام'' (خون کا جام)

اور’’ دبیدیاگلونہ‘‘(صحرا کے پھول:عبدالرسول رسا)۔

ایک لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ کمال خان اس کے پشتو زبان وادب کا استاد رہا۔اسلامیہ کالج پشاور میں پشتو کی ادبی محفلوں میں بھی وہ کمال خان کے ہم راہ ہوتا۔مشاعروں میں پشتو کے نام ور ادیبوں اور شاعروں سے تو چالیس کے عشرے میں واقفیت ہوئی تھی۔سمندر خان سمندر، محمد اشرف مفتون(جو ماما کے کلاس فیلو تھے)،حمزہ شنواری، فضل حق شیدا......گویا پشتو زبان کے علاوہ پشتو ادب سے بھی اس کی وابستگی ہوگئی تھی۔پشتو ادیبوں سے بھی اس کی شناسائی ہوئی تھی۔چنانچہ اب وہ پشتو رسالہ میں پشتو زبان ہی میں لکھنے لگ گیا۔

اسی سال یعنی دسمبر 1953 میں عبداللہ جان کا لیوٹالسٹائی کے ایک خوب صورت افسانے کا کیا ہوا بلوچی ترجمہ’نیستگاریں لوگ‘‘کے نام سے چھپا۔

سیاست کی طرف آیئے تو مشہور کمیونسٹ راہنما سوبھوگیان چندانی سے ماما کی پہلی ملاقات بھی اسی برس یعنی 1953 میں ہوئی جو پھر زندگی بھر ایک محترم دوستی کی شکل دھار گئی۔ہوا یوں کہ سوبھو صاحب نے بھی لٹ خانہ کے بارے میں سن رکھا تھا۔اس کے علاوہ ماما نے قادر بخش نظامانڑیں کے ہم راہ الیکشن میں ہاری پارٹی کے امیدوار برکت علی آزاد کے لیے جو کام کیا تھا، سوبھو صاحب نے اس بارے میں بھی سن رکھا تھا۔چنانچہ سوبھو صاحب لٹ خانہ والوں سے ملنے کوئٹہ آیا(2)۔خوب باتیں ہوئیں، بحث مباحثے اور اتفاق اختلاف ہوئے۔

اُس زمانے کی سیاست آج کی سیاست سے یکسر مختلف تھی۔ ماما پورے کا پورا ’’سیاست، سماجی تبدیلی کے لیے‘‘ میں وقف تھا۔ وہ سیاست کو ایک سماجی خدمت یا عام انسان کی سماجی زندگی اور معاشی حالت بدلنے اور بہتر بنانے کا وسیلہ سمجھتا تھا۔

تقریباً اسی زمانے میں گل خان نصیر کے مکتبِ فکر سے عبداللہ جان اور اس کے ساتھیوں کو اختلاف ہونے لگا۔ دراصل میر گل خان قلات کی ریاستی شکل میں ایک فیوڈل بادشاہت یعنی Khanate کی بحالی کی طرف داری کرتا تھا۔ جب کہ جمالدینی اور اس کے دوست اس کے برعکس ایک جمہوری بلوچستان کے حق میں تھے۔لہٰذا عبداللہ جان اور اس کے رفقا نے ایک تحریر تیار کی

اور اس کا نام رکھا:’’ہمارا بلوچستان‘‘۔ یہ ایک قسم کا منشور تھا جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ لوگ کس طرح کا بلوچستان چاہتے ہیں۔ اِن کے بلوچستان میں سرداری اور ریاستی نظام نہیں ہوگا۔ بلوچستان ایک صوبہ ہوگا جس میں سب لوگ جمہوری اور نمائندہ حکومت قائم کرنے کے لیے جدوجہد کریں گے۔اس میں نہ مستجار علاقوں کا مسئلہ ہوگا نہ ریاستی یا برٹش بلوچستان کا امتیاز۔ یہ ایک عوامی اور جمہوری صوبہ ہوگا۔(3)

یہ لوگ’’ہمارا بلوچستان‘‘ کو اس وقت مارکس اور اینگلز کے مینی فیسٹو کا درجہ دے رہے تھے۔’’ہمارا بلوچستان‘‘ کے سرورق پر اسی قسم کے نمایاں کوٹیشن درج تھے۔ یہ پمفلٹ تقسیم ہوا، اس پہ بحثیں ہوئیں اور ایک رائے بنتی گئی۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ یہ لوگ اس منشور کے مطابق ایک سیاسی پارٹی منظّم کریں گے۔ اور اس پارٹی کا نام عبداللہ جان نے تجویز کیا: ’’دیما رووک الس‘‘(آگے بڑھتے عوام)۔ اور غلام محمد نے اسے انگریزی میں ینگ ڈیموکریٹ بتایا۔

یہ لوگ بڑے انہماک کے ساتھ اپنی پارٹی کے لیے کام کرتے رہے، اور خونی رشتوں کے علاوہ کسی بھی تنظیم سے نا آشنا سماج میں سیاسی(اور ادبی وثقافتی) تنظیم سازی میں لگ گئے۔

مگر ظاہر ہے سیاسی پارٹی محض خواہشوں سے تو نہیں چلتی۔ ایک مقبول، عوامی اور ترقی پسند پارٹی کے بننے کے لیے ضروری حالات موجود ہی نہ تھے۔خود پارٹی چلانے والے دانش وروں کی ذاتی زندگیاں بھی مشکلات سے دوچار تھیں۔ روٹی کی ترسیل بھی مسئلہ بنتا جارہا تھا، تنظیم بھی کھڑی نہ ہو پارہی تھی اور قافلہ بڑھ بھی نہیں رہا تھا۔لٹ خانہ قائم رکھنے میں زبردست مالی مشکلات آرہی تھیں۔روٹی روزگار کا کوئی مستقل ذریعہ نہ رہا۔نوبت فاقوں تک آنے لگی۔

1955 میں عبداللہ جان لٹ خانے سے چلا گیا۔

ماما کا بڑا بھائی آزات جمالدینی کراچی سے’’بلوچی‘‘ کے نام سے ایک بلوچی ادبی میگزین جاری کر چکا تھا۔’’بلوچی‘‘ کا دفتر لی مارکیٹ میں ہوا کرتا تھا۔عبداللہ جان جمالدینی نے اسے جوائن کیا۔ ماما عبداللہ جان نے ایک طویل مسافرت بلوچستان کے ساحلی علاقوں کی کی۔ اور وہاں دفن بلوچی زبان وادب کے کئی درخشاں ستاروں کو منظر عام پہ لایا۔

عبداللہ جان ماہنامہ ''بلوچی'' کے لیے خریدار ڈھونڈنے اور قدیم بلوچی شاعری جمع کرنے مکران کا چکر لگا کر پسنی کے راستے کراچی پہنچے۔ چوں کہ ''فی الحال'' سر بمہر کر دیا گیا تھا، اس لیے لٹوں کے پاس پیسہ نہ تھا۔ لٹ خانہ کا کرایہ کچھ عرصہ تک عبداللہ جان کراچی سے بھیجتا رہا مگر یہ سلسلہ دیر تک جاری نہ رہ سکتا تھا۔ اس لیے مالک مکان کی طرف سے لٹوں کے خلاف مقدمہ درج کرالیا گیا اور عدالتی حکم سے لٹ خانہ خالی کرالیا گیا اور سارے لٹ بکھر گئے۔ چنانچہ ڈاکٹر خدائیداد، ملک عبداللہ جان کاسی کے پاس سکھر چلا گیا۔

کراچی بے روزگاروں کے لیے روزگار ہے، بے چھتوں کے لیے چھت اور بے روٹی کے لیے روٹی ہے۔ اس روزی رساں کراچی میں ماما کو سوویت انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں پروف ریڈری کا کام مل گیا۔ یہاں سے ''سوویت خبریں'' اور سوویت نیوز'' شائع ہوتے تھے۔ میر صاحب ''سوویت خبریں'' نامی مجلّے کی پروف ریڈنگ کرتا اور فارغ ہو کر ماھنامہ ''بلوچی'' نکالنے میں بھائی کی مدد کرتا۔(4)

مگر بھوک نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اس بار بھی بھوک کوئی علیحدہ وجہ بن کر نہیں آئی تھی بلکہ اب بھی یہ عبداللہ جان کے اپنے اعمال کے تسلسل میں نظر آئی تھی۔ اب کے بھوک کا دیو، آزاد صاحب کے ماہنامہ ''بلوچی'' کی صورت میں نازل ہوا۔ ان کے ''بلوچی'' نے مستقل خرچے کی صورت اختیار کر لی.....عبداللہ جان کے لیے کب کچھ بچ سکتا تھا۔ آزاد نے اپنی ہر چیز ''بلوچی'' کو دے ہی رکھی تھی، ماما عبداللہ جان کی ''تنخواہ بھی اس کی زد میں تھی''۔(5)

اپنی عادت کے مطابق کراچی میں بھی میر صاحب نے سیاسی وادبی دونوں لحاظ سے خوب سرگرم کام کیا۔ یہاں اس کی سیاست کا پلڑا بھاری ہوتا گیا تھا۔ یہاں اس کی ملاقات جی ایم سید، عبدالرسول نظامانی، منہاج برنا، سراج میمن، کامریڈ حسن ناصر، نورالدین سرکی، صہبا لکھنوی، انوار احسن صدیقی، یوسف نسکندی، لال بخش رند، اور اکبر بارکزئی جیسے جید لوگوں سے ہوئی۔ اور بائیں بازو کی سیاست سے اس کی وابستگی مزید مضبوط ہوتی گئی۔ اس کے علاوہ کراچی کے صنعتی مرکز نے مزدور طبقہ کی قوت اور توانائی کی اہمیت عبداللہ جان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھر دی۔

اس بڑے اور صنعتی شہر کراچی میں اُس کو یہ معلوم ہوا کہ ملک کے سارے جاگیردار ایک ہیں اور یہ کہ، سیاست ثقافت صحافت سب پہ جاگیردار قابض تھے۔ اسی لیے ماما فیوڈلزم کے کسی بھی ہتھکنڈے میں نہ پھنسا۔ وہ نہ تو میڈیا کی نام نہاد آزادی کے کسی دعوے نعرے پر بھروسہ کرتا تھا، اور نہ ہی وہ خطیب وقاضی، ملاّ مرشد، اور فلم ٹی وی کی چکنی چپڑی باتوں پہ کان دھرتا تھا۔ اُسے تو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ سب لوگ، اور یہ سب ادارے فیوڈل سیاست کے ہتھیار اور ساز وسامان ہیں۔

اس نے زیب النسا سٹریٹ پہ قائم ''ووکس لائبریری'' میں روسی زبان سیکھنی شروع کی۔ اس کے ساتھ اس تعلیم میں بلوچی زبان کے بہت ہی بلند پایہ شاعر جناب اکبر بارکزئی اور ترقی پسند ادیب وشاعر انور احسن صدیقی بھی شامل تھے۔ اُن کی اُستانی کا نام مارگونوف تھا۔ یہ تینوں بہت ہونہار طالب علم تھے اور استانی بہت مہربان خاتون تھی۔

اُنہی دنوں ایران میں دادشاہ نامی بلوچ کی بغاوت کا واقعہ ہوا۔ اُس کا بھائی احمد شاہ اپنے اور اپنے بھائی کی فیملی کے ساتھ سرحد کے اِس پار آیا۔ پاکستانی حکام نے مند کے مقام پر انھیں گرفتار کر لیا اور کوئٹہ بھیج دیا تا کہ انھیں ایران کے حوالے کر دے۔ کراچی کے بلوچوں نے ان کی ایران کی حوالگی کے خلاف زبردست جلسہ جلوس کیا۔ ایک متحد اور پر جوش تحریک چلی۔ عبداللہ جان ظاہر ہے اس تحریک کا روحِ رواں بن گیا۔ مگر احمد شاہ کو ایران کے حوالے کر ہی دیا گیا۔

1958 کے بدبخت مارشل لا نے دیگر تباہیوں کے ساتھ ساتھ ہمارے ماما، میر عبداللہ جان کو بھی بے روزگار کر دیا۔ مارشل لا سرکار نے سوویت انفارمیشن کے خبرنامہ ''سوویت خبریں'' کو بند کر دیا۔ اور کاپیاں سی آئی ڈی والے پریس سے اٹھا لے گئے۔ واضح رہے کہ جمالدینی اس کے ایڈیٹوریل بورڈ کا ممبر تھا۔ لہٰذا ایک بار پھر بے روزگاری، ایک بار پھر بھوک۔

ادھر بلوچستان میں بھی مارشل لا کی سختیاں رنگ دکھانے لگیں۔ ہر ترقی پسند گروہ، تنظیم اور پارٹی پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ عبدالکریم خان، خان عبدالصمد خان سب جیل بھیج دیے گئے تھے۔ غوث بخش بزنجو، گل خان نصیر، اور ان کے قریبی ساتھی گرفتار کر کے کوئٹہ کے فوجی کیمپ میں ڈال

دیے گئے۔عبداللہ جان نے اپنی بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور وہ اپنا ایک کمرے والا گھر خالی کر کے ریل گاڑی سے کوئٹہ چلا آیا۔اُس کراچی سے جو کہ نئے فکر اور نئی سوچ کی آماج گاہ تھا۔ جہاں سے وہ نئی دنیا اور سماج کے بارے میں باشعور ہوتا تھا۔کراچی ہمیشہ بلوچ عوام کی زندگی کی ترقی کی جدوجہد کا مرکز رہا۔عبداللہ جان نے یہی کراچی چھوڑ دیا۔

کوئٹہ آ کر وہ پھر سے اپنے سیاسی کیریئر سے وابستہ ہوگیا۔1960 میں وہ ملک محمد عثمان کاسی کے ساتھ چلتن میڈیکل ہال کے تجارتی کام میں شامل ہوا۔اس زمانے میں ون یونٹ کے خلاف تحریک عروج پر تھی۔ جمالدینی، نیشنل عوامی پارٹی میں نہ صرف شامل تھا بلکہ اس تحریک میں بہت سرگرم بھی تھا۔اس پارٹی کو مارشل لا نے غیر قانونی قرار دیا۔بعد میں جب یہ پابندی ہٹ گئی تو جمالدینی اور عثمان کاسی نے اس پارٹی کو از سر نو منظّم کرنا شروع کیا۔ایک بار پھر رابطے، پھر بحثیں، پھر دوڑ دھوپ، دورے.....سرکار کو اُس کی یہ تیزی پسند نہ آئی۔ چنانچہ گرفتار ہوا۔اسے کچھ ماہ تو ڈسٹرکٹ جیل کوئٹہ میں رکھا گیا۔پھر رہا کر دیا گیا۔

ایوبی مارشل لا کے خلاف اس نے زبردست اور سرگرم جدوجہد کی ۔ اس عوامی جدوجہد میں جو کچھ اُس سے بن پڑا وہ کچھ کرتا رہا۔ پمفلٹ پوسٹر، میٹنگ جلسہ جو طریقہ بھی ممکن ہوا اُس نے آمریت کے خلاف استعمال کیا۔ یہاں تک کہ اُسے اُس کے قریب ترین ساتھی عثمان کاسی کے ساتھ ایک ہی ہتھکڑی اور جولان میں جوتا گیا اور لے جا کر شاہی قلعہ لاہور میں پٹخ دیا گیا۔

مگر اسے دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔اس بار میر عبداللہ جان اور ملک عثمان کاسی کو شاہی قلعہ لاہور بھیج دیا گیا۔دو ہفتے کے بعد انہیں عدالت کے حکم پہ رہائی ملی۔اُن کے چلتن میڈیکل ہال کا کاروبار تباہ ہوگیا تھا۔سرکاری جاسوس ان کی زندگی کو اجیرن بنائے ہوئے تھے۔ان حالات میں اس کا بہت ہی اچھا دوست ٹھیکیدار عبداللہ جان ہی اُس کے کام آیا۔وہ ماما عبداللہ جان کو کراچی لے گیا اور اپنے چپس بورڈ کے کارخانے میں منیجر لگا کر اسے روزگار دے دیا۔

حوالہ جات

1۔جمالدینی۔لٹ خانہ۔صفحہ 119

2۔مری، شاہ محمد ''موئن جوداڑو کا جوگی''۔تعارف از عبداللہ جمالدینی

3۔جمالدینی۔لٹ خانہ۔صفحہ 147

4۔جمالدینی، پیش لفظ کتاب ''رژن'' مصنف: آزات جمالدینی۔1985۔المخزن پرنٹرز کراچی۔صفحہ 27۔

5۔جمالدینی۔ع۔ج ہفت روزہ عوامی جمہوریت لاہور۔7 اپریل 1981۔صفحہ نمبر 5

سبزی کی ریڑھی لگاتا ہے

تقدیر کو اس کی منیجری بھی اچھی نہ لگی۔ بلوچستان میں اس کے سیاسی دوستوں پہ پھر مصیبتیں تھیں۔ صوبے کے حالات پھر ابتر ہو گئے تھے۔ ماما آرام سے کراچی کیسے رہ سکتا تھا؟۔

چنانچہ دوست کی نوکری چھوڑنی پڑی اور نوشکی جا کر دم لیا۔ مگر بے روزگاری کوئی معمولی عذاب تو نہیں ہوتی۔ یہ ہر طرح کے رومانس، شوق اور کاز کا بھٹہ بٹھا دیتی ہے۔ چنانچہ اس بے روزگاری نے اسے دوبارہ ''غریب پرور شہر'' کراچی لا پٹخا۔ اس بار اس نے سبزی منڈی کراچی میں سبزی فروش کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ ٹماٹر کدو بیچتے رہنا۔ (بڑے لوگ کیا کیا سنتیں چھوڑ جاتے ہیں!!)۔

سخت محنت اور ایمان داری سے مختصر وقت کے اندر اندر اس کا کاروبار خوب پھیلا۔ ایک ریڑھی سے شروع کیا تھا، جلد ہی ایک دکان لے لی جس نے ''کوئٹہ ٹریڈرز'' کے نام سے خوب شہرت پائی۔ مگر اس چھلاوہ روح شخص کو سبزی منڈی کا بے روح ماحول کہاں بھاتا تھا۔ وہ اس کام سے بے زار تھا۔ گو کہ پیسہ اس میں بہت تھا مگر روح خالی تھی، دل خالی تھا۔ اور عبداللہ جان خالی جیب، خالی پیٹ تو رہ سکتا تھا، مگر خالی دل نہیں رہ سکتا تھا۔

طلوع

ادھر 1965 والی جنگ ہو چکی تھی پاکستان اور ہندوستان کے بیچ۔ اور ایوب کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کی تمام تر مخالفت کے باوجود سوویت یونین کی کوششوں سے دونوں ممالک کے درمیان معاہدِ تاشقند پر دستخط ہو چکے تھے۔ جس کے بعد سوویت یونین اور پاکستان کے درمیان تعلقات میں کافی بہتری پیدا ہو چکی تھی اور حکومتِ پاکستان نے سوویت سفارت خانے کو اردو، بنگالی اور انگریزی زبانوں میں ایک ماہنامہ شائع کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ سوویت لوگوں نے کراچی سے ''طلوع'' نامی رسالہ نکالنا شروع کیا۔

انہوں نے جمالدینی کو بلایا جو پہلے ہی ان کے میگزین ''سوویت خبریں'' میں کام کر چکا تھا۔ عبداللہ جان بہت خوش ہوا۔ لات ماری سبزی منڈی کو اور دوبارہ اپنے پسندیدہ کام میں شامل ہو گیا۔

وہ 1970 تک وہاں ''طلوع'' کا جوائنٹ ایڈیٹر رہا۔ انتہائی لگن اور جاں فشانی سے کام کرتا رہا۔ سب کے دل موہ لیے۔ بہت سے دوست بنائے۔ رسالہ کو خوب مقبول بنایا اور اپنے شعور و آگاہی کو خوب منور کیا۔

ماما ٹیچر بن گیا

بعدازاں اس نے ''طلوع'' کی جوائنٹ ایڈیٹری سے استعفیٰ دے دیا اور کوئٹہ چلا آیا۔
جہاں کچھ عرصہ بعد بلوچی اکیڈمی نے اسے ریسرچ سکالر مقرر کیا۔ وہ ایک سال تک بلوچی اکیڈمی میں بطور ریسرچ سکالر کام کرتا رہا۔

اس کی والدہ اسی زمانے یعنی 1970 میں فوت ہوگئی۔

بلوچستان میں جب نیپ دورِ حکومت میں بلوچستان یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس ادارے کی سرابرہی کے لیے اس وقت کے گورنر بلوچستان میر غوث بخش بزنجو کی نظرِ انتخاب پروفیسر کرار حسین پر پڑی جو اُس سے پہلے بھی بلوچستان میں بے مثال تعلیمی خدمات سرانجام دے چکا تھا۔ پروفیسر کرار حسین ادیب اور سکالر ہونے کے ساتھ ایک انسان دوست ماہر تعلیم بھی تھا اور وہ مادری زبانوں کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ لہٰذا اس نے جب یہاں بلوچستان میں ''مطالعہِ پاکستان'' کا شعبہ قائم کیا تو بلوچی، پشتو اور براہوئی زبانوں میں عالم اور فاضل کی کلاسوں کا اجرا کر دیا۔ بلوچی زبان کے لیے بھلا پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی سے بہتر کون استاد اسے مل سکتا تھا۔ تب منتخب حکومت میں یونیورسٹی آف بلوچستان نے اسے بلا لیا اور استاد کی حیثیت سے ملازمت دے دی۔

''یہ میرے لیے خوش گوار حیرت تھی'' وہ کہتا تھا۔
مگر کچھ لوگ کسی اور آدمی میں دلچسپی رکھتے تھے، اُسے بھرتی کرالیا، اور ماما منہ تکتا رہ گیا۔
اس کے پاس پارٹ ٹائم ٹیچر کا انتخاب رہ گیا، اس نے انکار کر دیا۔
اگلے سال یونیورسٹی نے اسے فل ٹائم لیکچرار کی حیثیت سے بھرتی کر لیا۔
لہٰذا بلوچستان یونیورسٹی میں 1971ء میں استاد کی حیثیت سے اس کا تقرر ہوا۔
یہاں بلوچی زبان پر کام کرنے والے محقق اور سکالر تحصیلِ علم کی خاطر جمالدینی صاحب سے استفادہ کرتے۔ وہ سارا وقت درس و تدریس اور علمی ادبی کاموں میں جتا رہتا۔
بہت محنت کی میر صاحب نے پڑھانے میں اور خوب خدمت کی بلوچی زبان و ادب کی۔

پھر جھلک سیاست کی

اسی زمانے میں نیپ حکومت میں موجود اپنے تمام رفقا سے میر عبداللہ جان کو اختلاف ہونے لگا۔ بالخصوص اپنے دو بہت ہی عزیز اور قریبی ساتھیوں میر گل خان نصیر اور میر غوث بخش بزنجو سے۔ یہ دونوں اصحاب سوشلزم پہ تو یقین رکھتے تھے اور جس کے لیے اُن کی قربانیاں بھی لازوال رہی تھیں۔ مگر حصولِ اقتدار کے دوران ان سے شاید بہت ہی فاش موقع پرستیاں بھی سرزد ہوئیں۔ جن کی گرفت عبداللہ جان کو کرنا ہی تھی۔ البتہ اس کا یارِ غار لالہ غلام جان شاہوانڑیں اب زندہ نہ تھا۔ اب کے اس کے ساتھ ایک اور فکری ٹیم تھی۔ جو کہ غلام جان کی طرح شفاف نہ تھی بلکہ پیپلز پارٹی کے ساتھ بھی کبھی اجلے اور کبھی مشکوک ڈانڈے ملائے رکھتی تھی۔ (اور اُن لوگوں کے پاس اُن تعلقات کے حق میں ایسی دلیلیں ہیں کہ آپ حیران رہ جائیں)۔

1971 میں بلوچستان میں ''ششک'' نامی ٹیکس کے خلاف کافی بحث وتمحیص رہی۔ سرداروں کا یہ ٹیکس بہت ظالمانہ تھا۔ ششک دشمنی بالآخر جھالاوان کے علاقے میں باقاعدہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی جو بہت جلد اردگرد کے علاقوں میں پھیل گئی۔ واضح رہے کہ انتخابات کے دوران جھالاوان میں سردار اور سردار زادوں نے عوام سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ ان کے امیدواروں کو کامیاب بنائیں تو سردار لوگ اُن سے ششک والا ٹیکس (پیداوار کا چھٹا حصہ) نہیں

لیں گے۔ (واضح رہے کہ ''ششک'' سردار کو ملنے والے ایک اور ٹیکس یعنی ''مالیہ'' کے علاوہ تھا)۔

مگر انتخابات جیتنے کے بعد نیپ اپنے وعدوں سے مکر گئی۔

کاشت کاروں کا ایک وفد فریاد کے لیے جناب غوث بخش بزنجو کے پاس پہنچا اور اسے ششک معاف کرنے کا اُس کا وعدہ یاد دلایا۔ مگر اس نے بھی واضح الفاظ میں کاشت کاروں کو بتا دیا کہ یہ تو اُن کی جدی پشتی میراث ہے۔ اسے وہ کسی طرح چھوڑ نہیں سکتے۔

جب اگلے برس یعنی 1972 میں بزنجو، بلوچستان کا گورنر بنا اور عطا اللہ مینگل وزیر اعلیٰ، تو کاشت کاروں کا وفد ان سے ملا۔ مگر انھوں نے صاف صاف جتا دیا کہ ''ششک'' سردار کا حق ہے، جسے بہر حال وصول کیا جائے گا۔

کاشت کاروں نے کوئی اور چارہ نہ دیکھ کر ''ششک'' دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ایک مقبول اور مضبوط تحریک جھالاوان اور آواران میں چلی۔ سردار طبقہ کی حمایت میں پولیس اور ملیشیا کی فورس پہنچ گئی اور کاشت کاروں پر گولی چلا دی۔ جھالاوان میں ایک کسان، اور آواران میں ایک کسان، اور دو بچے ہلاک ہو گئے۔ بے شمار گرفتاریاں کی گئیں۔

اس پر، سب سے پہلے بلوچستان کے وزیر اطلاعات جناب گل خان نصیر نے ایک پریس کانفرنس میں اسے الفاظ و اصطلاحات کے ہیر پھیر کے ذریعے قبائلی اراضیات اور لٹھ بندی کا معاملہ قرار دے کر پیش کیا۔ بعد میں بزنجو صاحب نے بھی بعینہٖ یہی مؤقف اپنایا۔

اب عبداللہ جان کیا کرتا؟۔ الیکشنوں میں اُس نے نیپ کو جتوا تو دیا مگر ظاہر ہے کہ اس نے فوراً ہی ششک نامی سرداری ٹیکس کے خلاف ہونا ہی تھا۔ اس نے اس جابرانہ ٹیکس کی شدید مخالفت کی۔ اور ششک لینے والے سرداروں اور اُن کی حکومت کے خلاف زبردست مہم چلائی۔ ششک تو ختم نہ ہوا اور کسان تو آزاد نہ ہوا، البتہ کسانوں کی ترجمانی کرنے والا یہ خوب صورت انسان اپنے پرانے اور سنہرے دوستوں سے باقاعدہ الگ ہو گیا۔ یوں حکمران حکمرانی کرتے رہے، اور اُن کے سابقہ سارے دانش ور ساتھی عوام کی طرف داری کرتے رہے۔

عبداللہ جان اس بڑی موقع پرستی سے دل برداشتہ ہو کر رہ گیا۔ اس نے اگست

1972 میں پندرہ روزہ ''نوائے وطن'' کوئٹہ میں ''ششک کا مسئلہ'' کے عنوان سے ایک سائنسی اور جامع مضمون لکھا۔اس مضمون میں اس نے بلوچستان کے معاشی سیاسی نظام کے ارتقا کا جائزہ پیش کیا۔اوراپنے سابقہ رفقا کوآڑے ہاتھوں لیا:

''گورنر بزنجو صاحب! ہماری زبان میں سردار اور اس کے طبقے کو'لٹوک و پلوک' اور انگریزی میں اسے'Exploiter' کہا جاتا ہے۔ جو دراصل عوام دشمن ہیں۔لوگوں کی تمام مشکلات کا سبب ہمارے ہاں یہی طبقہ ہے۔ جو کچھ بھی نہیں کرتا اور سب سے زیادہ حصہ لے جاتا ہے۔ بلوچستان کے لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اب بھی عوام سے سرداروں کا طبقہ مختلف علاقوں سے بیگار، بجار، چھیڑ، پرسی اور کئی دیگر ناجائز ٹیکس وصول کررہا ہے۔۔۔

بزنجو صاحب اوران کی حکومت نے ششک کے مسئلے کے بارے میں جو اقدامات کیے ہیں وہ سرداروں کے طبقہ کے بہترین مفاد ہیں''۔(1)

حوالہ

1۔جمالدینی۔ع۔ج۔ششک کا مسئلہ۔پندرہ روزہ نوائے وطن کوئٹہ۔9اگست 1972

یونیورسٹی، کامیابیاں

جس وقت بلوچستان یونیورسٹی قائم ہوئی تو عبداللہ جان ٹیچر کے بطور اُس سے وابستہ ہوا۔علمی فضا میں تو اس نے نکھر جانا ہی تھا۔ یہاں اُس کے ہم خیال علما موجود تھے۔مگر نعمت دیکھئے کہ یوں وہ نوجوانوں سے براہِ راست رابطے میں آیا۔ اُس زمانے میں سارے طلبا سیاسی ہوا کرتے تھے۔اوروہ سب کے سب سامراج دشمن سیاست کرتے تھے۔ ماما فوراً ہی آٹو میٹک طور پر اُن کا امام بنا۔وہ ہر تنظیم کا محترم استاد اور گائیڈ بنا، بالخصوص بی ایس او عوامی کا۔

ایک استاد کی حیثیت سے پروفیسر جمالدینی کو رول ماڈل اور Mentor کہا جانا چاہیے۔ وہ نہ صرف اپنے مضمون کی تدریس میں ایک خاص اسلوب رکھتا تھا بلکہ طالب علموں سے نہایت شفقت سے پیش آتا تھا۔ جامعہ بلوچستان میں اس کا کمرہ طلبا کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا، جہاں تعلیم و تدریس کے علاوہ ترقی پسند نظریات اور جمہوری اقدار کی پاس داری کے بارے میں معلومات افزا گفتگو جاری رہتی تھی۔ پروفیسر جمالدینی کے تعلیمی مشن میں روشن خیالی اور خرد افروزی کا فروغ شامل تھا۔اسی لیے وہ نوجوانوں پر خصوصی توجہ دیتا تھا۔طلبا سے اس کا سلوک مشفقانہ، ہم دردانہ اور دوستانہ ہوتا تھا۔ وہ بعض بزرگوں کی طرح پند و نصائح سے کام نہیں لیتا تھا بلکہ مسائل پر سائنٹفک انداز میں غور و خوض کرنے کا راستہ ہم وار کرتا تھا۔نئی نسل کے ذہن اس نے اس طرح تیار

کیے تھے کہ رفتہ رفتہ نوجوانوں میں فلسفہ، تاریخ اور سائنسی معلومات کے مطالعے کا ذوق بڑھا۔ بلوچستان یونیورسٹی میں اس وقت نئے اساتذہ کے ساتھ ساتھ وائس چانسلر پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر بندے حسن، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر وارث اقبال، پروفیسر شکراللہ، پروفیسر بہادر خاں، پروفیسر تنویر جہاں تیموری، پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی، پروفیسر سحر انصاری، پروفیسر خلیل صدیقی، پروفیسر شمیم احمد، ڈاکٹر اقبال محسن، بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اس وقت طلبا کی یونین بھی قائم ہوئی اور اساتذہ کی انجمن کی داغ بیل بھی پڑی۔ طالب علموں میں اپنے حقوق کی جدوجہد اور اساتذہ کے مسائل کے حل کے سلسلے میں بھی پروفیسر جمالدینی نے غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ تدریس کے ساتھ ساتھ طلبا کی ذہنی تربیت کو بھی وہ خاص اہمیت دیتا تھا۔

اس دوران وہ اپنا تدریس کا پیشہ جاری رکھے ہوئے تھا۔ اپنی یونیورسٹی ملازمت کے دوران اس نے بلوچی زبان کے سکالروں کی ایک بہت بڑی کھیپ تیار کی جو آج بلوچی زبان وادب کے کارواں کی صفِ اول میں بڑی مستعدی کے ساتھ خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ جمالدینی ہی کی کوششوں سے بلوچستان یونیورسٹی میں 1985ء میں بلوچی ایم اے کی کلاسز شروع کرائی گئی تھیں۔ اس نے گھوم پھر کر طالب علم ڈھونڈے، انہیں داخلہ دلوایا اور بہت محنت وشفقت سے پڑھایا۔

اسی دوران عبداللہ جان جمالدینی نے بلوچستان یونیورسٹی سے اردو ادب میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔ پہلے وہ ''پاکستان سٹڈیز'' کے شعبے میں رہا۔ بعد میں جب یہ شعبہ، مطالعہ پاکستان سے ہٹ کر بلوچی، براہوئی اور پشتو کے الگ اور مستقل شعبوں میں بٹ گیا تو ماما شعبہ بلوچی کا چیئرمین بن گیا اور ریٹائرمنٹ تک تشنگانِ علم کی پیاس بجھاتا رہا۔

لیکن کہاں ریٹائرمنٹ؟ تعلیم و تدریس کا سلسلہ تو اس نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد موت تک جاری رکھا ہوا تھا۔

افغان انقلاب

پھر، اسی ستر کی دہائی میں 1978 میں افغان انقلاب کا نیک بخت سورج پھوٹا۔ یہ ایک عظیم واقعہ تھا۔ اُس کے سارے ساتھیوں نے اس انقلاب کو لٹ خانہ کی آدرشوں کی تکمیل قرار دیا۔ شادان ومسرور عبداللہ جان پھولے نہ سماتا تھا۔ وہ ان تھک انداز میں نوجوانوں کے سامنے اُس انقلاب کی گرہیں کھول کھول کر بتاتا جاتا۔ اُس انقلاب کے ہر آزاد بخش اقدام وفرمان عبداللہ جان کے دل کی آواز جو تھے۔ اور جب اس انقلاب کے دمکتے درخشاں چہرے کو تاریکی کی قوتوں نے گرہن لگانی شروع کی تو ماما اُن چند لوگوں میں سے تھا جو اس کے دفاع میں ڈٹ کر کھڑا رہا۔ اس انقلاب کے خلاف ساری سازشوں کا مرکز چوں کہ اُس کا اپنا ملک تھا اور وہاں مداخلت اُس کے اپنے سرحدی صوبہ بلوچستان کو بنا دیا گیا تھا۔ اس لیے وہ دگنی ذمہ داری کے ساتھ، ایک طرح کے کفارے کے بطور جوش وخروش سے انقلابِ افغانستان کی حمایت میں کام کرتا رہا۔ وہ تحریر میں، تقریر میں اور عام گفتگو میں اس انقلاب کے بارے میں دنیا بھر کے نشریاتی اداروں کے پیدا کردہ شکوک دور کرتا جاتا۔ حتیٰ کہ وہ ہمارے عوام کی سیاسی تحریک کا وزیرِ خارجہ بن کر ایک عدد خفیہ دورہ بھی قندہار و کابل تک کا کر چکا تھا اور وہاں کے لیڈروں سے مل چکا تھا۔ نہ سی آئی ڈی کو پتہ چلا نہ نصیراللہ بابر کو۔ وہ آہٹیں تک دبا کر راستہ چلنا جانتا تھا۔

بلوچ کا عاشق

میر عبداللہ جان کو اپنی گل زمین سے جنون کی حد تک محبت تھی۔ وہ بلوچستان کے لیے بے انت اختیار اور واک کی تمنا رکھتا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ استحصالی قوتیں اس خطے میں یا تو حب الوطنی کے پیچھے چھپ کر اپنی کارستانی کرتی رہتی ہے یا پھر عقیدہ کا سہارا لے کر ایسا کرتی ہیں۔ چنانچہ بہانہ ون یونٹ کا ہوتا یا ترقی کا' میر صاحب، ہر مشکوک قدم کی چاپ سے یوں بدک جاتا تھا جیسے پہاڑ کے گڈ اور گرانڈ کسی درندے کو دیکھ کر بدک جاتے ہیں۔ بلوچ عوامی قومی تحریک سے اُس کی وابستگی اس قدر زیادہ ہوتی گئی کہ وہ پوری ایک دہائی تک بلوچستان کو ایک آزاد ریاست کے بطور قائم کرنے کی زیرِ زمین جدوجہد میں بھی شامل رہا۔

وہ زہر آلود ماحولیات، ملاوٹ زدہ خوراک، جنگی جنون الغرض ہر مردم دشمن مظہر کے خلاف تھا۔ نواز شریف کے دور میں جب چاغی کا پہاڑ راسکوہ ایٹمی دھماکوں کا شکار ہوا تو ماما عبداللہ جان کا روہانسا ہونا ہمیں یاد ہے۔ وہ ضمیر نیازی کی کتاب ''زمین کا نوحہ'' کے بار بار حوالے دیتا تھا۔ اُس نے ایٹمی دھماکوں کے خلاف گودی گوہر ملک کا افسانہ ''بلوچا مناں تیلا نک دات'' (بلوچ نے مجھے دھکا دیا) سیکڑوں لوگوں کو پڑھوایا تھا۔ اُسے غیر پیداواری اخراجات سے، اسلحہ کی دوڑ سے اور بالخصوص ایٹمی اسلحہ کی دوڑ سے شدید نفرت تھی۔

ٹریڈ یونین

میر عبداللہ جان کی سیاست کا ایک اہم حصہ ٹریڈ یونین ازم تھا۔ اس نے سندھ اور بلوچستان کے نہری علاقوں میں کسانوں کو منظّم و باشعور بنانے میں بہت کام کیا۔ کسانوں پر سرداری ٹیکس ''ششک'' کے خلاف جدوجہد کی اور مزدوروں کی تنظیم کاری کے لیے بہت کوششیں کیں۔

بعدازاں جب وہ کراچی گیا تو وہاں عملاً مزدور تحریک میں شامل ہوگیا۔ وہ اُن کے طبقاتی شعور کو بڑھانے، اور اُن کی تنظیم سازی میں بہت سرگرم رہا۔ بلوچستان کی ٹریڈ یونین تحریک کے ساتھ بھی اُس کی وابستگی مثالی رہی۔

خواتین

میر عبداللہ جان اپنے افکار کی مطابقت میں عورتوں کے سماجی سیاسی حقوق کے بارے میں ہمیشہ حساس رہا۔ وہ عورتوں کو سماجی تبدیلی کا بہت اہم حصہ سمجھتا تھا۔ وہ عورتوں کی تکریم کرتا تھا۔ اُن کے ساتھ محترمہ، گودی، بانک یا پھر خونی رشتہ کے الفاظ استعمال کر کے مخاطب ہوتا تھا۔

عورتوں کی تعلیم، ان کو باشعور بنانے اور ان کے غصب شدہ حقوق کی بازیابی کے لیے انھیں منظّم کرنا عبداللہ جاب کے مشن کا اہم حصہ تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی ڈیوٹیاں لگاتا تھا کہ عورتوں کو سیاست میں شامل کرنے کا کام کرتے رہا کریں۔ وہ زندگی بھر عورتوں کو ان کے مسائل اور حقوق کی بنیاد پر منظّم کرتا رہا۔

اپنی زندگی کے آخری برسوں میں عورتوں کی اُس بڑی کانفرنس سے بہت ہی خوش ہوا جو آٹھ مارچ 2005 کو کوئٹہ میں منعقد ہوئی تھی۔

بیرونِ ملک سفر

1988 میں وہ انگلینڈ چلا گیا۔ بلوچستان یونیورسٹی میں روشن فکر اور علم کے خزانے کا مالک پروفیسر مجتبیٰ حسین اس کا گہرا دوست تھا۔ مجتبیٰ حسین صاحب کے دو دوست لندن میں تھے: افتخار عارف اور آصف جیلانی۔ ان کے نام مجتبیٰ صاحب نے عبداللہ جان کے لیے صرف ایک فقرے پر مشتمل یہ تعارفی خط دیا:

''ایک آدمی بھیج رہا ہوں''۔

عبداللہ جان جمالدینی نے اٹلی، ناروے، سویڈن، انگلینڈ، متحدہ عرب امارات اور ایران سمیت کئی ایک ممالک کے تعلیمی دورے کیے اور مختلف اداروں میں توسیعی لکچر دیے۔

1993 میں ادیبوں کے ایک وفد کے ہم راہ اسے عوامی جمہوریہ چین جانا تھا۔ مگر انہی دنوں اُس پہ فالج کا دورہ پڑا۔

خاندان

آزاد جمالدینی

1981 کے 5 ستمبر کے دن آزاد جمالدینی انتہائی غربت، کسمپرسی اور بیماری کے خلاف لڑائی ہار کر بلوچستان میں فوت ہوگیا اور وہاں چار صدیاں قبل 1568 میں 5 ستمبر ہی کے دن تو ماسو کمپنیلا اٹلی میں پیدا ہوا۔ ایک سردار و سرداری نظام کے خلاف کمر بستہ ہوا تو دوسرے نے چرچ کے مذہبی سرداروں کی نیندیں اچاٹ کر دیں۔ ایک نے اپنی زندگی ماہنامہ ''نوکیں دور'' اور ''بلوچی'' کو دے دی تو دوسرے نے پچاس جیل خانوں کے اندر تینتیس برس کا جیل بھگتا۔ ایک نے ''رژن'' لکھا تو دوسرے نے City of Sun یعنی ''سورج کا شہر'' لکھا۔ ایک بلوچستان کا انقلاب چاہتا تھا تو دوسرا اٹلی کے ضعیفوں کی نجات پہ کمر بستہ تھا۔ آزات بیسویں صدی کا مارکسسٹ تھا اور کمپنیلا سولہویں صدی کا یوٹا پیائی سوشلسٹ تھا۔ مضحکہ خیز یاروں نے' صدیوں کے سوشلزم کے ارتقا کی تاریخ کو، فقط ایک روس کے ٹوٹنے سے جوڑ دیا!!۔

آزات جمالدینی کو میں نے پہلی بار 1978 میں ڈان ہوٹل میں دیکھا۔ شام کا وقت تھا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ کوئٹہ کے جناح روڈ پر چہل پہل رہتی تھی۔ اس زمانے میں ڈان ہوٹل بالخصوص نیم دانشور، نیم شاعر اور نیم سیاسی ارواح کا ٹھکانہ ہوتا تھا۔ میں اور اللہ بخش بزدار بالترتیب اپنے سوشلزم اور نیشنلزموں کو زور شور سے سچا جتا رہے تھے۔ جب اللہ بخش خاموش ہوا اور باہر کی طرف

تھوتھنی نکال کر آہستگی سے ''آزات جمالدینی'' نامی شخص کا نام لیا اور مجھ سے اس کا تعارف کرنے کی خاطر شلوار کے پانچے بلند کیے۔ میں نے بہت ادب سے معمر شخص سے مصافحہ کیا۔ لیکن' یا تو بڑے لوگ پہلی بار لفٹ کم دیتے ہیں' یا پھر کم سن لوگ حریص زیادہ ہوتے ہیں۔ حالاں کہ میرے ساتھی نے تعارف بھی اچھا خاصا طویل کیا تھا مگر پھر بھی جی بھر کے بغل گیری نہ ہوئی۔ وہ لاغر سا، پستہ قد شخص تھا، پشمینہ ٹوپی سر پر چہرے کو دکھوں اور محنت کی جھریوں نے آلیا تھا، .....آزات نے دیر تک بلوچی لٹریچر، شاعری اور اپنے میگزین کے بارے میں باتیں کیں۔

ہماری دوسری ملاقات سے قبل ہی اس نے میرے لیے اپنا رسالہ بھیجنا شروع کر دیا۔ یہ رسالہ ایک طرف تو بلوچی زبان وادب کی خدمت کر رہا تھا تو دوسری طرف یہ طبقاتی جدوجہد میں نچلے طبقات کا وارث تھا۔ آزات کا ماہنامہ ''بلوچی'' امریکی سامراج کا پکا پکا دشمن تھا۔ سردار اور سرداری نظام کے بارے میں ایک صدی قبل جو کام آزات کا رسالہ کر رہا تھا آج اکیسویں صدی اور سائنس و ٹیکنالوجی کی موجودگی میں بھی کوئی رسالہ واخبار نہیں کر پا رہا۔ آزاد کا رسالہ قومی آزادی کا علم بردار تھا۔ اس نے اپنا رسالہ سائنس، تعلیم، ترقی اور عام انسانوں کی آبادی اور خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔

اس میگزین نے بہت سے لوگوں کو لکھنے کی ترغیب دی جو آگے چل کر اُن میں سے بڑے ادیب، شاعر اور اور آرٹسٹ بنے۔

ماہنامہ ''بلوچی'' نے بلوچی زبان کی بہت خدمت کی؛ شاعری کی بھی، نثر کی بھی۔ اس نے شاعری کی تاریخ اور قدیم گم گشتہ دولت کو تلاش کر کے دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اس نے رسم الخط بنایا اور بلوچی کو ایک تحریری زبان کے بطور زندہ کر دیا۔ بلوچی کے الگ الگ لہجوں کی باہمی قربت کے لیے بہت کام کیا۔

آزات جمالدینی رسالے کے اندر عام آدمی سے بات کرتا تھا' اُس سے گلہ شکوہ کرتا تھا' اُس سے لکھنے کی مدد چاہتا اور اُسی سے چندہ اور پیسہ لیتا تھا۔ اس نے اپنی دولت حتیٰ کہ اپنی صحت بھی اسی رسالے کی نذر کر دی۔ آزاد اس پورے پیادہ سفر میں نہ تھکا، نہ ناامید ہوا۔ اس نے ہر در بہ دری دیکھی لیکن وہ ماتھے پہ ناکامی، تھکن اور بے زاری کی شکنیں نہ لایا۔

بلوچی ادب کی ترقی میں بھی آزات کا اچھا بڑا حصہ ہے۔ آزات بہت اچھا شاعر تھا۔ اس کی انقلابی شاعری کا دور وہی تھا جب اس کے ہم عمر لوگ جن کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کی تفصیل لکھ رہے تھے، یا، بلوچی اکیڈمی میں صدر مملکت کی تقریر کا بلوچی ترجمہ کر کے زبان کی خدمت کر رہے تھے۔ یا پھر، فوجی حکمرانی کے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں عوام کو سوویت یونین، پڑوسی ممالک اور خود بلوچستان میں سیاسی ورکروں کے خلاف ''عقل'' سے نواز رہے تھے۔ اور مارشل لاؤں کے سول سیکرٹریٹ کوئٹہ میں عوام کی فائلوں پر ''ادبِ عالیہ'' کی تخلیق میں مصروف تھے۔

قوموں کی طرح زبانوں اور بولیوں کے کلچر بھی جدا جدا ہیں۔ اور بلوچی زبان ذرا ''بُر'' اور ''ترھانڑ'' ہے۔ یہ پالتو نہیں ہے۔ اس کی بُنت میں عرضداشتی کیفیت موجود نہیں ہے۔ اس کا خوب صورت لہجہ اس کے کوہستانی بود و باش سے مطابقت میں ہے۔ چیلنج، ہکل ہوکا، کے الفاظ لپک جھپٹ اور پل وجھل کے مترادفات بلوچی زبان کے خرمن میں ذرا زیادہ ہیں۔

شہ مرید اور جام درک نے بلوچی کے اڑیل گھوڑے کی پیٹھ پر اپنے دکھی اور پیاسے ہاتھ بہت پھیرے۔ بعد میں مست والمست توکلی نے بلوچی زبان کو پچکار پچکار کر' جی و جان کہہ کہہ کر' منتیں واسطے دے دے کر اور اپنی محبت کے موٹے موٹے آنسوؤں سے تراش خراش کر کے اُسے سمو جیسا حسین بنایا۔ مست کے بہت سے مرید پیدا ہوئے، آزات بھی ان میں سے ایک تھا۔

آزات جمالدینی نے شاعری کا سارا آس پاس باطل کر دیا۔ اس کا لہجہ نرم، مگر الفاظ بہت تلخ تھے۔ آزاد جمالدینی نے تنظیم، جہد، امن اور فتح کی طرح کے نئے الفاظ بلوچی شاعری کے ذخیرے کو عطا کر دیے۔

بلوچی زبان میں ایسے تلخ و تیز الفاظ نہ رہ گئے ہوں جو آزاد نے سرداروں کے خلاف، جاگیرداروں، ملاؤں کے خلاف اور بیوروکریسی کے خلاف استعمال نہ کیے ہوں۔ آزاد نے مظلوم بلوچ کے دکھوں پہ محض ماتم نہ کیا بلکہ ان دکھوں کا سبب تلاش کیا اور چور کے پیروں کے نشاں سردار و سرکار کے گھر تک پہنچا دیے۔ آزاد ایک ڈائریکٹ شاعر تھا، نہ اگر مگر کرتا تھا اور نہ بات زبان کے نیچے چھپاتا تھا۔ اس کی بلوچی بہت سادہ، عوامی اور خالص تھی۔

آزاد شاعری کے کئی میدانوں میں دوڑا مگر وہ اصل میں نظم کا شاعر ہی ہوا۔ اس نے ہمارے وطن سے انگریز کے نکلنے کے وقت شاعری شروع کی تھی۔ اس نے اپنی قوم کے لیے حسین مستقبل کے خواب دیکھے اور اس مستقبل کے لیے کام کیا' لکھا اور شعر کہے۔ آزاد کو اپنا وطن بہت عزیز تھا۔ بلوچ و بلوچستان اُس کی محبت' تفکر اور ہم دردی کے مراکز تھے۔ وہ تمام عمر اپنے وطن سے بچھوؤں کو دور کرنے کا نیک کام کرتا رہا۔

یہ الگ بات ہے کہ بلوچ ماما نے اس کے پیغام کا آسان ٹکڑا تو اٹھا کر جیب میں ڈال دیا، مگر مشکل حصہ باہر تھوک دیا۔ قتل کرنا اور قتل ہو جانا، اگر اپنے پراسیس سے الگ کیے جائیں تو پھر یہ بہت آسان کام رہ جاتے ہیں، یہ بہت ہلکے کام رہ جاتے ہیں۔

ایک بے ثمر سوچ ہم پہ مسلط ہے۔ ہمارے دائیں کندھے پر روایتوں، عقیدوں کے صدیوں کے مرے ہوئے مردار لدے ہوئے ہیں اور بائیں کندھے پر بادشاہت و خانی کی دوبارہ بحالی کی خواہش۔ ہم ''فرسٹریٹ'' کیے جا رہے ہیں۔ ہماری قوم کو ڈانواں ڈولی کی بیماری میں مبتلا کیا جاتا رہا ہے۔ ہم، نہ آگے بڑھتے ہیں نہ دوسروں کے لیے راستہ چھوڑتے ہیں۔ ہماری قوم چاکر، گوئہرام اور بالاچ کے کھنڈر شدہ محلات کے علاوہ کسی اور جگہ پر فخر ہی نہیں کرتی۔ یہ ''جدوجہد'' کرتی ہے فیوڈل کی قیادت میں۔ اس کے سیاست دان کا شعور اپنے ورکر کی بہ نسبت چار سو سال پیچھے ہے' اس کا فلاسفر ابھی تک رِندی عہد کے اشعار کی جگالی کرتے رہنے سے آگے نہ بڑھا' اس کا علم، سائنس، آرٹ سب نقالی ہے۔ اس قوم کے نوجوان قبائلی جنگوں کے ذریعے پوسٹ ٹیکنالوجیکل ریولیوشن کی ہم گامی کر رہے ہیں۔ اگر عبدالواحد نے جیئند، خلیل خان اور گل بی بی کی پاک ارواح سے راستہ پوچھ کر تلاش کر لیا تو ہمارے پاس تو ہر وادی و دمن میں ایک ابوالکلام مراد ساحر موجود ہے' ملک الشعرا گل خان ہے، کوئی نام ور عطا شاد' روایت پرستی کا سامنا کرنے والا کوئی اکبر بارکزئی موجود ہے' قلم کی مالکن کوئی گوہر ملک.....' عبدالرحمٰن پہوال' عبداللہ جان جمالدینی.....المختصر ہماری راہ پہ ہزاروں قطب کے ستارے روشن ہیں۔

گھر میں ہم سب فیوڈلوں کے ظلم و جبر کے شعلوں کے جھلسے لوگ ہیں' ہم سب داخلی

ظالم اور بیرونی ظالم کا ساتھ دینے والوں کے حملے کی شب بیداریوں کے نشاں ہیں اور خدا کی مخلوق کے دکھوں کی اندوہنا کی نے بھی ہم سے ملاقات کر رکھی ہے۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ بلوچ قوم آباد ہو' بس ہماری ناکامی کا سبب یہ ہے کہ ہم نے مست کی طرح محبوبہ کے پیچھے کیچ و مکران گھسٹنا چھوڑ دیا ہے۔ ہم ریڈی میڈ کامیابیاں چاہتے ہیں۔ زر، علم، بخت، پارٹی، مینڈیٹ' حتیٰ کہ انقلاب بھی ریڈی میڈ ملے۔

یاروں نے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے ہر بدصورت کام کو جائزہ قرار دیا۔ کرسی ملے پھر دیکھیں گے۔ آقا کے سامنے دوز انو ہو کر فریاد کرنا ہے، اس کے پیر چومنے ہیں.....''سائیں ایک کرسی دے دو''.....ڈی سی نے ہاتھ میں سماج کی مہار تھام رکھی ہے جسے چاہے محروم کر دے اور جسے چاہے کرسی دے۔ اور وہ دھوکے سے ووٹ لیتا ہے.....اتنی موقع پرستی، اس قدر ابن الوقتی؟۔ آزات بالکل اس راہ کا نہ تھا۔ وہ تو فرق طرح کے قول دے رہا تھا۔

گشنت و ھدا گوں دو دستاں سلامیں
مارِنداں چُش کنغ پر ما حرامیں
زمانہ بڑ بہ بیت' چَپ اچ رہا مئے
چمر پونز ئے جناں' اے مئے کلا میں

ترجمہ:

کہتے ہیں وقت کو دو ہاتھوں کا سلام ہو
ہم رِند (بلوچ) ہیں، ایسا کرنا ہم پہ حرام ہو
زمانہ بدک جائے گم راہ ہو جائے
اسے نکیل لگا دیں گے یہ قول ہے

آزات جمالدینی روایت پرستیوں' ماقبل فیوڈل تعصّبات اور ماضی و حال کی زنجیروں سے آزات تھا۔ میری اس کے ساتھ استادی شاگردی والا بھائی چارہ چلتا رہا۔ ہر ملاقات ایک نئے آزاد سے ملنے کا موجب بنتی گئی۔ اس کی سیاست، ادب اور صحافت کی تہہ در تہہ صلاحیتیں آشکار ہوتی گئیں۔

ناگہاں ایک روز پتہ چلا کر آزاد ہسپتال میں داخل ہے۔ تلاش کر کے ملا۔ وہ چارپائی پر دراز تھا۔ تھکن و بیماری کی کمزوری ظاہر تھی۔ مگر پھر بھی ہمت والی ضد، اٹھ بیٹھ کر معانقہ کیا۔ بولنے لگا کہ ''میں رسالہ 'بلوچی' کے لیے چندہ کرنے مکران گیا۔ بس میں رش بہت تھا' جگہ نہیں تھی اس لیے چھت پر بیٹھنا پڑا۔ وہاں مجھے سردی لگی''۔ مجھے سخت غصہ آیا مگر اب تک پتہ نہیں کہ وہ غصہ اصل میں کس پہ تھا۔ آزات پہ؟' بس پہ؟ موسم پہ؟ کچی سڑکوں پہ؟ یا، پورے نظام پہ؟۔

ہمارے ڈاکٹروں نے آزات کو کراچی کے ڈاکٹروں کی طرف بھیجا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ آزات کو گلے کا کینسر ہے۔ کچھ عرصہ وہاں علاج کرایا۔ پھر کوئٹہ آ گیا، پھر کراچی گیا۔ فاقہ زدگی اور بے خرچی والی مسافرتیں کرتے کرتے آزات بالآخر 5 ستمبر کو وہ اُس سفر پہ چلا گیا جہاں سے واپسی کا پھیرا نہیں لگتا۔

آزات مر گیا۔ مگر اس کریم الطبع اور فہمیدہ مردے اور ہم زندوں کے درمیان رشتے کا ایک باریک دھاگہ ضرور موجود ہے۔ یہ دھاگہ نہ ٹوٹے شالا!!

ادبی میدان میں بھی جمالدینی صاحب نے کٹھن کام اپنے سر لیا۔ ایک ایسی زبان کو ترقی دینا جو بہت پسماندہ ہو، جس کا رسم الخط تک وضع نہ کیا گیا ہو، جس کا لہجہ مختلف علاقوں میں مختلف ہو۔ یہ کام صرف آزاد ہی کر سکتا تھا۔ آزات نے اس زبان میں نہ صرف ادبی کتابیں لکھیں بلکہ گم شدہ ادب اور شاعری کو تاریخ کے اندھیروں سے چھان کر نکالا اور اس کے قدیم ادب پر تحقیق کی۔

جمالدینی نے کبھی کسی ''بڑے'' سے توقع نہ رکھی تھی کہ وہ بلوچی زبان کی ترویج کی خاطر اپنا پیسہ ''ضائع'' کرے گا۔ اسی لیے وہ اپنے رسالے کے تقریباً ہر شمارے میں عام لوگوں سے معاونت کی اپیل کرتا بلکہ کبھی کبھی تو وہ صاف لکھ دیتا کہ مجھے اہلِ سرمایہ کا چندہ نہیں چاہیے۔ مجھے عام آدمی کی ہمدردی چاہیے۔ ادیبوں کی قلمی معاونت چاہیے۔

آزات جمالدینی نے اپنا رسالہ 1956 میں کراچی سے شائع کرنا شروع کر دیا تھا۔ بلاشبہ یہ مجلّہ جدید بلوچی ادب کے آغاز کی نوید بنا۔ دراصل جدید بلوچی ادب کی ابتدا اسی زمانے میں ہوئی۔ اس رسالے میں بلوچی کے بہترین انشائیے، افسانے، ڈرامے اور مضامین شائع

ہوئے۔ یہیں، اسی رسالے کے احیا کے زمانے میں بلوچی کہانی نے جنم لیا۔ ایسی جدید کہانی جس میں سماجی جبر، نابرابری، سمگلنگ، منشیات، بے روزگاری، جہالت، علاج معالجہ کے فقدان، رشوت ستانی، حادثات، ڈاکے اور اغوا جیسے موضوعات کو سمویا گیا۔ رسالے نے جدید اور ترقی پسند فکر کو فروغ دینے اور عوام الناس کے شعور کو بلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ عورتوں کی خستہ حالی، سماج میں ان کی بے حرمتی اور ان کی مشکلاتِ زندگی کو بہت زور اور استقلال سے پیش کیا گیا۔ اسی طرح فیوڈل نظام کے خلاف باقاعدہ ایک مہم کی صورت، یہ رسالہ چلتا رہا۔ ''بلوچی'' نامی اس رسالے کا اجرا اور اس کے ذریعے بلوچی زبان و ادب کی ترویج میں آزاد جمالدینی کا کارنامہ سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

''مستیں توار''، اور ''رژن'' اس کی شاعری کے دو مجموعے ہیں۔ اس نے اپنی نظم کے ذریعے قوم کو مروت، جرات، آزادی اور ننگ کا پیغام دیا ہے۔ اس کی معروف ترین نظم ''ما امن لوٹاں'' (ہم امن چاہتے ہیں) نے اس کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔ یہ نظم بنی نوع انسان کے مسائل کے پس منظر میں بلوچ عوام کی راہیں متعین کرتی ہے۔ بلوچی زبان میں مست توکلی کے بعد آزات جمالدینی ہی وہ بڑا انسان ہے جس قبائلی جنگی معاشرے میں رہ کر بھی امن کی مدح سرائی کی ہے۔ مست کا ضرب المثل بننے والا مصرع یوں تھا:

جواں نہ ینت جنگانی بذیں بولی
(اچھی نہیں ہیں جنگوں کی بری باتیں)

اور آزات نے مست توکلی کے اس فکر کو بہت ترقی دی۔ اور اس کی تخلیق کردہ شہرۂ آفاق نظم ہر بلوچ کو زبانی یاد ہے۔ موسیقیت بھری اس پُرمغز نظم کے دو بند یوں ہیں:

تُف تُف بہ جنگا
بم وتو پنگا
خونخوار پشنگا
بے نام وننگا
امن ءِ پلنگا

استن ما انسان، ما امنہ لوٹاں

جنگ بارت دستی
طاقت وہستی
کاریت نیستی
شُد، تنگ دستی
ڈکا ل ونیستی
لعنت بہ جنگا

استن ماانسان۔ ماامنہ لوٹاں

ترجمہ:

تُف تُف ہے جنگ پہ
خونخوار بھیڑیے پر
بے نام ونگ پر
امن پہ حملہ آور پر
ہم تو ہیں انساں، امن کے ہیں خواہاں
جنگ فوراً تباہ کرتی ہے
طاقت اور ہستی ختم کرتی ہے
نیستی نازل کرتی ہے
بھوک اور تنگ دستی،
قحط اور افلاس
لعنت ہو جنگ پہ
ہم تو ہیں انساں، امن کے ہیں خواہاں (31)

حوالہ

1۔ آزات جمالدینی۔ مستیں توار۔ 2004۔ سنگت اکیڈمی آف سائنسز کوئٹہ۔

بلوچستان سنڈے پارٹی

BSP

بزرگ سن میر عبداللہ جان پہ سال 1993 میں فالج کا بہت خطرناک حملہ ہوا تھا۔ اس کا بایاں پیر اور بایاں ہاتھ بے کار ہو گئے۔ اس کے دوست احباب اور معتقدین چوبیس برس تک مسلسل ہفتہ وار تعطیل کے دوران اس کے ہاں جمع ہو جاتے رہے؛ اس کی عیادت کے لیے۔ اس طرح اس کی مزاج پرسی بھی ہو جاتی تھی، حال حوال بھی رہتا تھا اور اسے کمپنی بھی ملتی تھی۔

روزِ اول سے یہ طے ہو گیا تھا کہ اس کی محفل میں کوئی سخت یا پیچیدہ بحث نہیں کرنی ہے۔ سو فیصد ہلکے پھلکے موضوعات اور ہنسی مزاح پہ مشتمل یہ محفلیں آخر تک اسی ایجنڈے پر چلتی رہیں۔ سیاست، ادب، سماجیات پر بحثیں دلائل ہوتے تو تھے مگر بہت ہی قابلِ ہضم انداز میں۔ وجہ یہ تھی کہ اسے بلڈ پریشر تھا اور وہ جذباتی طور پر زوردار اثر لینے والا بن چکا تھا۔ جب بہت جذباتی ہوتا تھا تو بلڈ پریشر بہت جلد شوٹ کر جاتا تھا۔ اور اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔

چوں کہ پہلے بھٹو صاحب کی اسلام پرستی میں جمعہ کی چھٹی جاری ہو گئی تھی لہٰذا یہ انجمن مامی زبیدہ جمالدینی کے دیے ہوئے 'بلوچستان جمعہ پارٹی' یعنی BJP سے چلتی تھی، مگر بعد میں جب جمعہ ختم کر کے اتوار کو چھٹی کر دی گئی تو اس اکٹھ کا نام ''بلوچستان سنڈے پارٹی'' یا BSP پڑ گیا۔

واضح رہے کہ ماما عبداللہ جان جمالدینی کے پاس سنڈے پارٹی جمنے سے قبل یہ پارٹی ہر اتوار ساڑھے دس بجے آدھ گھنٹہ کے لیے ڈاکٹر خدائیداد صاحب کے ہاں جمتی تھی۔ بعد میں جب میر عبداللہ جان کو فالج ہو گیا تو دوستوں نے یہ محفل اس کے ہاں جمانے کا فیصلہ کیا۔

تب سے یہ اس قدر مستقل اور مشہور اجتماع بن چکا کہ باہر سے بلوچستان آنے والے احباب بھی اپنا پروگرام ترتیب دیتے وقت اتوار کا دن ضرور خالی رکھتے تا کہ بلوچستان کے نمائندہ دانش وروں اور ادیبوں سے ملاقات ہو سکے۔

بلاشبہ بلوچستان سنڈے پارٹی کوئی ایجنڈے دار گروپ نہیں رہی اور نہ ہی اس کی کوئی تنظیمی صورت رہی تھی۔ یہ محض اپنے سینئر ''ساتھی'' کی دل جوئی، عیادت اور تکریم کی نشست رہی۔ باقی حاصلات تو ''بائی پراڈکٹ'' بھی تھیں اور ''ناگزیر'' بھی۔

اولاد

پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی کے سات بچے ہیں: تین بیٹے اور چار بیٹیاں۔ محترمہ نور جہان سب سے بڑی بیٹی ہے۔ پھر جیئند خان ہے۔ اس کے بعد بالاچ ہے۔ شمس النسا اور عابدہ کے بعد بیٹا دوستین ہے۔ اور سب سے چھوٹی بچی کا نام سنگین ہے۔

جیئند جمالدینی سب سے بڑا بیٹا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں پہلے ڈی ایس ایف اور بی ایس او میں بہت ہی سرگرم سیاسی کارکن رہا۔ پھر ''اینٹی سردار'' بنا۔ ایک زمانہ تھا جب وہ گوریلا گیری کا بہی خواہوں میں رہا۔ مگر بعد میں اُدھر بھی جی نہ لگا، سرکار کے ساتھ ویسے بھی کوئی روشن فکر انسان جا نہیں سکتا۔ اب وہ بلوچستان بھر کے دانش وروں کی طرح ہر جگہ اور ہر چیز سے غیر مطمئن ہے اور ہر پلیٹ فارم پہ بے اعتبار۔ بہت ہی سادہ، سچا اور کھرا آدمی ہے۔ اس اکیسویں صدی کے بہت بڑے دانش ور کا تعلیم یافتہ بیٹا ایک ایسی یونیورسٹی میں علم حاصل کرنے لندن کا خرچہ برداشت کر کے چلا گیا، جو (وہاں جا کر) معلوم ہوا کہ جعلی ہے۔ جیئند خان بلوچستان یونیورسٹی میں ٹریژرر رہے۔ قالینوں کے کاروبار سے ہوتے ہوئے کچھ عرصہ ٹی وی میں فلم سازی کرتا رہا۔ ''رژن'' نامی پروڈکشن میں اپنے دوستوں کے ساتھ خوب صورت ڈرامے بنائے۔

ہمارے اس اچھے دوست کا بیٹا ''فریدون'' اپنی بھرپور جوانی میں ہے۔ لہٰذا کبھی تخیل میں

انقلاب و آزادی کی خاطر پہاڑ پر چڑھتا ہے اور کبھی دادا کے لاجک کے پھندے میں گرفتار۔ فیصلہ نہ کر سکنے والا وقت کتنا مزیدار مگر کتنا جان لیوا ہوتا ہے!!

فریدون کا نام عبداللہ جان نے فردوسی کے شاہنامے کے ایک کردار کے نام پہ رکھا ہے۔ اسی فردوسی کے ایک کردار ''رودآبہ'' کا نام (فردوسی کے شاہنامہ میں رستم کی ماں) اس نے اپنی پوتی یعنی جیئند کی بچی پر رکھا ہے جو میری بچی خیال زادی کی ہم جماعت ہے۔ بلوچستان کی بیٹیوں سے بلوچستان نے بہت ساری امیدیں، بہت سارے توقعات وابستہ کر رکھے ہیں۔

دوستین سیکرٹریٹ میں سیکشن افسری کرتے کرتے گورنر ہاؤس میں ایک اہم عہدے تک جا پہنچا۔ پھر اس کے خدا، کو یہ سب کچھ اچھا نہ لگا اور وہ واپس درس و تدریس کے اپنے آبائی پیشے کی طرف لوٹ آیا مگر پھر سول سیکریٹریٹ اور سیکریٹری کا عہدہ۔ خدا اُس کی عاقبت بچائے!!۔

دوستین جان کی بیگم گوہر جان نے ماما کی بڑی خدمت کی۔ اُس کی بیماری کے ربع صدی وہ اُس کی خدمت وعیادت ونرسنگ کرتی رہی۔ ہر اتوار کو بیس پچیس ''عیادتیوں'' کے مجمعے کو وہ پچیس برس تک چائے، چپس، بسکٹ، کھجور، لاچی دانہ، چنے، بادام کھلاتی رہی۔ ماما کے انتقال کے بعد ہم گذشتہ چار ماہ سے سنڈے پارٹی کسی اور جگہ منتقل نہ کر پائے کہ وہ احتجاج کرتی ہے۔ ہم اُس کے گھر کے افراد جو بن چکے ہیں۔ اب اگر اتوار پارٹی کسی اور جگہ ہو تو ظاہر ہے اس کا دل تو ٹوٹے گا۔ بہنوں، بیٹیوں کی محبت کو کون تول سکا ہے!۔

ماما کے تیسرے صاحبزادے کا نام بالاچ ہے۔ وہ اپنے آبائی گاؤں بڑو میں زمینداری کرتا ہے۔ دونوں بیٹے دوستین و بالاچ یورپی سوشلسٹ ممالک سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں ماما کی چار بیٹیاں ہیں۔ نور جہاں، عابدہ، سنگین، اور شمس النسا۔ ماما نے اپنی بیٹیوں کو بیٹوں ہی کی طرح تعلیم دلا دی۔ ان کی تربیت کی، اور انہیں مناسب جگہوں پر بیاہ دیا۔ خدا انہیں باپ کی روحانی جائیداد کا شایانِ شان وارث رکھے۔ ماما جیسا انسان دوست اور جمہوری شخص ظاہر ہے اپنی ساری اولاد سے محبت کرتا تھا۔ اسے اپنے پوتوں نواسوں سے بہت انس تھا۔ بیٹیوں میں سے محترمہ سنگین اس کی چہیتی بیٹی تھی۔ سنگین نے بھی بیماری کے عالم میں اس کی خوب

خوب خدمت کی۔

یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ماما نے اپنے پہلے بیٹے کا نام فلسفے کے اپنے محترم استاد، صاحبزادہ ادریس پہ رکھا تھا۔ وہ بچہ دیر تک جی نہ سکا اور خدا کا مال خدا کے اپنے پاس کم عمری ہی میں بلا لیا گیا۔

ماما کی اہلیہ خود اپنی پیرانہ سالی کے باوجود بیمار خاوند کی خدمت کرتی رہی۔ مامی زبیدہ، عبداللہ جان کی چچا زاد تھی، فقیر جان کی بیٹی۔ وہ ہر وقت ماما کے دوستوں کی عزت، ان کی مہمان نوازی میں جتی رہتی تھی۔ وہ اپنے خاوند کے خیالات سے نہ صرف متفق تھی بلکہ ان پہ فخر بھی کرتی تھی۔ سائیں کمال خان تو اسے ''کامریڈہ'' کہتا تھا۔

آیئے ذرا مامی کے بارے میں کچھ اور پڑھتے ہیں:

مامی زبیدہ جان جمالدینی (2016.....1930)، فقیر جان اور محترمہ جہاں گل کی بیٹی تھی۔ لگ بھگ 1930 کی پیدائش ہے۔ وہ پانچ بہنیں اور دو بھائی تھے۔ وہ کلّی جمالدینی سے تعلق رکھتی تھی۔ ماما عبداللہ جان سے اُس کی شادی سولہ یا سترہ برس کی عمر کو ہوئی تھی۔

مامی نے ازدواجی زندگی کے تقریباً ستر (70) برس کا پہلا حصہ انتہائی سختی اور مشکل میں گزارا۔ خاوند سیاسی سرگرمیوں میں ہمیشہ گھر سے باہر رہتا تھا۔ جیل، شاہی قلعہ اور لٹ خانہ اُسے گھر اور علاقے سے باہر رکھتے تھے۔ پھر روٹی روزگار کی تلاش میں وہ یہاں وہاں بھٹکتا رہتا۔

میاں بیوی کو ساتھ رہنا تب نصیب ہوا جب خاوند کو کراچی میں روزگار کے امکانات میسر آئے۔ مگر یہاں بھی بہت کم آمدن کے ہاتھ تنگدستی حیات کو اجیرن رکھے تھی۔

خاوند کے انقلابی سیاسی خیالات مامی نے بھی اپنا لیے۔ میل جول بھی اُنہی افراد اور خاندانوں سے تھا جو انقلابی سیاست کرتے تھے۔ اس تبدیل شدہ جمالدینی خاتون کو ظلم اور غربت میں پسی ہوئی مخلوق کے ساتھ طبقاتی ہمدردی اور یکجہتی پیدا ہوتی گئی۔ یوں وہ خاوند کی سوشلسٹ تحریک کا حصہ بن گئی۔

سابقہ لٹ خانے کے لوگ تو فیملی کا حصہ ہی تھے۔ وہ اس گراں قدر و باوقار ساتھی کی

بہت تکریم کرتے تھے۔ سائیں کمال خان شیرانی تو جب بھی عبداللہ جان سے ملتا تو احترام سے لبریز آواز میں پوچھتا، ''کامریڈہ کا کیا حال ہے''؟۔ ہم عبداللہ جان کو ''ماما'' کہتے تھے۔ اسی نسبت سے محترمہ زبیدہ کو ''مامی'' کہتے تھے۔

وہ ایک شکر گزار اور صابر خاتون تھی۔ اولاد کی تعلیم یا فٹگی میں مامی کی محنتوں محبتوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ بیٹوں بیٹیوں اور اُن کی اولادوں میں گھری رہنے کے باوجود خاوند اور اس کے دوستوں کی خدمت سے کبھی غافل نہ رہی۔ سراپا شفقت تھی وہ۔ اسے انقلابی سیاست کی خوب شد بد تھی۔ وہ روایتی تعلیم تو حاصل نہ کرسکی، محض اردو اخبار پڑھ سکتی تھی مگر آپ گفتگو کرتے تو وہ ایک باشعور سیاسی ورکر کی طرح سیاست کی موٹی موٹی باتیں وضاحت سے بیان کرتی۔

گھر میں ہمیشہ سے ایک جمہوری ماحول تھا۔ افراد ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ ہر وقت ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر باتیں ہوتی تھیں۔ بلوچی کلاسیکی ادب پر عالمی ادب کے تناظر میں بحث ہوتی تھی۔ چنانچہ ساری اولاد میں بھی ماں باپ کے سیاسی خیالات سرایت کر گئے۔ انسان دوستی سرفہرست تھی۔ اُس پورے گھرانے میں ''غیبت'' کا داخلہ ممنوع تھا۔ دل آزاری کفر تھی۔

مامی روایتی بلوچ عورت تھی۔ ملتی تو مخاطب کے گھر کی عورتوں بچوں کی خیریت پوچھتی۔ کوئی بیمار ہوتا تو اُس کی خیریت اور تیمارداری کو خود بھی جاتی اور ہر آنے جانے والے سے بھی پوچھتی رہتی۔ رشتہ دار خاندانوں کا خیال رکھتی۔ وہ اپنے محلے میں نیک اور صلح جو بزرگ خاتون کے بطور جانی جاتی تھی۔

وہ بہت خلاّق اور شیریں لسان تھی۔ خوب صورت رخشانی لہجے کی بلوچی بولتی تھی۔ اُس کی گفتگو عام بلوچ بزرگ عورتوں کی طرح باوقار تھی، اور بہت دلچسپ مقامی چٹکلوں اور مزاح سے بھرپور۔ اس کا چہرہ ایک پُرشفقت ماں کا چہرہ لگتا تھا۔

''کامریڈہ'' کو دمہ کا مرض تھا۔ ہر وقت سانس کی تکلیف میں رہتی تھی۔ ڈاکٹری نسخوں، رنگ برنگی ادویات اور انہیلروں سے ٹوکری بھری رہتی تھی۔ دمہ کی بیماری پہ جس قدر ہجو اور لعن طعن مامی کرتی تھی شاید ہی کسی اور نے کی ہو۔ وہ اپنی بیماری پہ خوب ہنستی تھی۔ معدے کے کینسر میں مبتلا

عبدالرحمٰن پہوال جس طرح معدے کے خلاف بولتا تھا، مامی اس سے کئی گنا زیادہ پھیپھڑوں کی نااہلی پہ پھبتیاں کستی تھی۔ رخشانی بلوچی میں پھیپھڑے کو ''پُپ'' اور دمہ کو ''ہیسک'' کہتے ہیں۔ اور مامی اِن دو الفاظ کے خلاف ایک کتاب تک لکھ سکتی تھی..... اور اس حوالے سے ڈاکٹروں کے خلاف بھی!!

اس بیماری نے اس کے آخری دو تین سال بہت عذاب کے سال بنا دیے۔ اوپر سے آخری چھ آٹھ ماہ ٹانگ کی ہڈی ٹوٹنے کے یکے بعد دیگرے دو آپریشن ہوئے۔

چنانچہ جو معمر عورت گذشتہ ستر برس سے محبوب کی طرح کے اپنے خاوند کے ناز اٹھاتی رہی تھی، اب خود خدمت کی محتاج ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے اپنے جمہوری، مساواتی اور انسان کی عزت کرنے والے خاوند سے بے پناہ پیار تھا۔ بیٹے جب اُسے کراچی علاج کی پیشکش کرتے تو اُس کا جانا پہچانا حسین ترین جواب یہ ہوتا ''تئی پستا ایو کا نیلیں'' (تمہارے باپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی)۔

ہم دوست احباب بھی جب اس سے اصرار کرتے کہ ''ہمارے گھر چلیں، ہمارے بچے بہت یاد کرتے ہیں۔ انہیں ملو اور کھانا کھا کر واپس آ جاؤ''۔ تب بھی اُس کا یہی جواب ہوتا ''تئی ماما ایو کیں، مس آہتہ نہ کنیں'' (تمہارا ماما اکیلا ہوگا، میں نہیں آ سکتی)۔ حالاں کہ گھر میں بیٹیاں، بہوئیں اور پوتیاں نواسیاں موجود ہوتیں۔ مگر وہ بوڑھی خاتون اپنے بیمار خاوند کو آدھ گھنٹہ بھی اکیلا نہ چھوڑتی۔

ماما کی گفتگو میں بھی ہمیشہ دو تین بار یہ لفظ ضرور ہوتا ''تئی مامی'' نے یہ کہا، وہ کہا.....''۔ ماما عام طور پر اُسے نور جانئے ماس (نور جان کی ماں) کہہ کر پکارتا تھا اور مامی اپنے محبوب کو ''نور جانئے پث'' (نور جان کا باپ) کہہ کر پکارتی تھی۔ بلوچی بولنے والے بچے اُسے ہمیشہ برا ہوئی لفظ ''لُمہ'' (ماں) کہہ کر پکارتے تھے۔ ہماری تو وہ بس، مامی تھی۔

19 ستمبر کو فالج کا بیمار اور چورانوے سالہ یادداشت و گویائی ترک کردہ خاوند ایک کمرے میں دنیا سے بے خبری کے ایک دو سال بعد موت کی آغوش میں تھا، تو ایک دوسرے کمرے میں خاوند کی موت سے بے خبر معمر بیوی آکسیجن چڑھے اور دھونکنی کی طرح تکلیف دِہ تنفّسی عمل میں چار چھ کامریڈ ڈاکٹروں کی ہنگامی طبی امداد کو مسترد کرتی، خاوند کا ساتھ دے گئی۔ جیون ایک ساتھ، مرگ ساتھ.....

ہم ایک ساتھ دو وطن پرست اور انسان دوست کمیونسٹ بزرگوں سے محروم ہوئے۔

تالیف وتصانیف

ایک بوڑھے شخص نے مجھے ایک عجیب بات بتائی۔ یہ کہ، کوئی اور زبان بولنے کی اہلیت پیدا کرنے سے اُس زبان کی تقریباً ساری دانش سارا شعور اُسے منتقل ہو جاتا ہے۔ محض زبان سیکھنے سے اس زبان کا ہزاروں برس کا سارا ضرب المثالی ادب، مصرع وشعر، تاریخی حوالوں سے بھرے محاورے سب کے سب آٹو میٹک انداز میں اُس شخص کی جھولی میں آ جاتے ہیں۔

ماما بہت خوش قسمت تھا۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ میر عبداللہ جان جمالدینی نے خود کو بلوچی زبان و ادب کے لیے وقف کیے رکھا تھا۔ اس نے اردو میں بھی بہت لکھا۔ اس کے علاوہ براہوئی اور پشتو میں بھی اس کی تحریریں موجود ہیں۔ انگریزی میں البتہ اس کی چند ہی چیزیں ہیں۔ اس نے ایک ذمہ دار اور عوام کے ساتھ مکمل طور پر جڑے ہوئے شخص کی طرح ادبی کام کیا۔ وہ اپنی پوری ادبی زندگی ایک ترقی پسند، روشن خیال اور انسانوں کا خیر مانگنے والا لکھاری رہا۔

ماہنامہ پشتو کے اولین شمارے میں محترم میر عبداللہ جان جمالدینی کا مضمون ''پشتو ادب'' بہت تعریف کے لائق ہے۔ میر صاحب پشتو کے ساتھ بہت محبت رکھتا تھا۔ اس کا پشتو میں یہ اولین مضمون بہت شان دار اور کامیاب کوشش تھی۔

ہمارا رواج یافتہ طریقہ ہے کہ ہم سکور بورڈ اٹھا لیتے ہیں اور مصنف کی کتابیں گننے لگ جاتے ہیں۔ یہ گویا ہمارا روزمرہ کا طریقہ ہے۔ مگر بلوچستان میں معاملہ عجب رہا۔ یہاں ہماری کم آبادی میں ہونے کے معروض نے ایک ہی ممتاز شخص سے سیاست، صحافت اور تصنیف کے کام لیے ہیں۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ 1920 کے یوسف عزیز مگسی سے لے کر 2016 کے عبداللہ جان تک ہمارے اکابرین ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔

میر عبداللہ جان جمالدینی کی تصانیف گنوانے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ اس نے مصنف بننے کے ساتھ ساتھ مصنف ساز بننے کا کام زیادہ کیا۔ چنانچہ آج بلوچستان اور بلوچستان سے باہر جتنے بھی لوگ ''بلوچ'' اور ''بلوچی'' پر لکھتے ہیں، وہ سب کے سب میر صاحب کے معتبر آستانۂ علم سے ایک آدھ جام پی کر ہی گزرے ہیں۔ ماما نے بے شمار ادیب سدھائے ہیں، لاتعداد شاعر سلجھائے ہیں، درجنوں دانش ور پیدا کیے ہیں۔ لکھنے کی ترغیب دینے سے لے کر اس نیک بزرگ نے لوگوں کو اُن کی کتابوں کے چھپوانے اور چھپوا کر فروخت کرنے تک میں مدد کی ہے۔ لہٰذا ماما ایک خوب صورت لکھاری ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی فیکٹری بھی رہا جہاں سے ''مصنف'' نامی DNA تیار ہوتے رہے ہیں۔

میر صاحب پانچ زبانوں میں لکھتا تھا۔ اور ادب وثقافت کے ہر موضوع پر بھرپور طریقے سے لکھتا تھا۔ پاکستان کے مترقی حلقوں کی جتنی کانفرنسیں ہوئی ہیں، ان میں وہ بہ نفس نفیس شرکت کرتا رہا۔ اسی طرح بیمار پڑنے کے بعد تقریباً ہر سیمینار میں اس کا پیغام پڑھا گیا۔ بلوچی کے علاوہ پشتو کی تمام کانفرنسوں اور اردو و پنجابی کی مقامی، قومی اور عالمی کانفرنسوں کے لیے بھی اس کا پیغام منتظمین کے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں رہا۔

ایک طبقاتی معاشرے کا ادب وفن دراصل ایک بہت ہی پیچیدہ کام کرتا ہے۔ یہ ہوتا تو بالادست طبقے کا ادب ہے مگر وہ ایسا بہت کھل کر نہیں کرتا۔ یہ ایسی سلیمانی ٹوپی ہوتی ہے جس کا بہت مبہم کام یہ ہوتا کہ سماج کے ایک طبقے کے اقتدار و بالادستی کو ''فطری'' دکھائے۔ یا پھر، لوگوں کو یہ سرے سے دکھائی ہی نہ دے۔

میر عبداللہ جان نے بلوچی کا محض ایک افسانہ ''پاکیں مہر'' لکھا۔ اور وہ بھی فارسی سے ماخوذ۔ افسانہ میں چوں کہ پلاٹ فرضی بنانا پڑتا ہے اور فرضی کام عبداللہ جان نے کبھی کیا نہیں۔ چنانچہ مستقبل میں پھر افسانہ اس سے نہ لکھا گیا۔ اور اسی سبب سے اس سے شاعری بھی نہ ہوسکی۔ اس نے زندگی میں محض ایک عدد نظم کہی ہے، اور وہ بھی ایک بلوچی گانے کی نقل مار کر۔ ہر سنڈے پارٹی میں کسی نہ کسی بہانے وہ یہ نظام سنا ڈالتا تھا۔

ماما کی اصل مہارت ''رپورتاژ نویسی'' تھی۔ وہ زبردست بیانیہ انداز اپناتا تھا۔ وہ تحریر میں بہت ہی سادگی برتتا تھا۔ عبداللہ جان اپنی یادداشت پہ بہت تکیہ کرتا تھا، کمپیوٹر جیسی یادداشت، تازہ بہ تازہ۔ حاضر ناظر.....اور یادداشت ہی تو دانش ہے، دانش وری ہے۔

میر عبداللہ جان کی سامراج دشمنی کسی بھی قسم کے شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ وہ اپنی ساری زندگی نوآبادیت اور استعمار کو مسترد کرتا چلاتا آیا تھا۔ اُس نے، بالخصوص انگریزوں کی برصغیر میں آمد اور قبضے کو کبھی بھی جائز نہ سمجھا۔ مگر وہ ایسا کرتے ہوئے سب لوگوں کے سارے کاموں کو رد نہیں کرتا تھا۔ وہ ہر قابلِ تعریف انسان کی بڑھ چڑھ کر تعریف کرتا تھا۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتا ہے:

> ''دورِ غلامی کی کسی خارجی شخصیت سے اگر بلوچ دانش وروں کو محبت ہے اور اس کا ذکر وہ نہایت ادب سے کرتے ہیں تو وہ شخصیت لانگ ورتھ ڈیمز کی ہے۔ ڈیمز دورِ افرنگ کے ایک سول افسر تھے۔ مگر انھوں نے اپنے سرکاری فرائض کے باوجود بلوچی قدیم شاعری کو قلم بند کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا''۔(1)

میر صاحب کے ہاں ادب، اپنے عہد کے سماج کا عکاس ہوتا ہے۔ ہر سماج کے پیداواری رشتوں کی نوعیت پورے ادب کو اپنی نمائندگی کرنے پر لگا دیتی ہے۔ مثلاً وہ بلوچی زبان کے سب سے بڑے شاعر جام درک کی شاعری کی خصوصیات کا سبب اور پس منظر یوں دیکھتا ہے:

> ''.....جام درک کی شاعری کا ماحول نسبتاً بدلا ہوا ہے۔ بلوچ زمینداری اور جاگیرداری دور میں داخل ہوئے۔ یہ اٹھارویں صدی تھی۔ سماج

اوراس کے تقاضے بدل گئے۔شاعری کا رنگ ڈھنگ بھی بدلا۔ہمسایہ
زبانوں خصوصاً فارسی نے بلوچی زبان پر اثر کرنا شروع کیا۔جام درک
کی شاعری میں غنائیت زیادہ ہے۔غزل کا رنگ نمایاں ہے۔جام کی
تشبیہات اوراشعار فارسی کے زیر اثر ہیں۔عربی اورفارسی الفاظ کی
بہتات ہے۔(2)

عبداللہ جان شاعروں،فلسفیوں، ہیروؤں اورادیبوں کوتاریخی مادیت کے اصولوں کے مطابق دیکھتا تھا۔

اس کی تصانیف درج ذیل ہیں:

1۔لینن کی کتاب ''دیہات کے غریب'' کا کیا ہواترجمہ۔

2۔بلوچستان میں سرداری قبائلی نظام کا سیاسی پس منظر

3۔مُرگِ مینا

4۔لٹ خانہ

5۔شمعِ فروزاں

6۔دوجلدوں جتنا غیر مطبوعہ،مگر موجود ومحفوظ کام

7۔انقلاب ایران۔(ترجمہ)

8۔کردگال نامک۔(ترجمہ)

حوالہ جات

32۔جمالدینی۔ع۔ج۔ادبی رجحانات۔1984۔اکیڈمی ادبیات پاکستان۔صفحہ 34۔

33۔جمالدینی۔ع۔ج۔''بلوچی ادب میں روایت''۔کتاب ادبی جائزے۔اکادمی ادبیات پاکستان۔1986 صفحہ 195۔

قبائلی نظام کا سیاسی پس منظر

ماما کا قابلِ ذکراورشایداولین کتابچہ بلوچستان کے سرداری نظام پراُس کی تحقیق ہے۔

گوکہ اس کا پہلا مطبوعہ مضمون ''چاغی کے سفید ہاتھی'' کے عنوان سے سرداروں کے خلاف تھا۔مگراس نے اصل شہرت ہفت روزہ ''لیل ونہار'' میں دوقسطوں میں شائع ہونے والے مضمون سے حاصل کی۔جس کا عنوان تھا:''بلوچستان میں سرداری قبائلی نظام کا سیاسی پس منظر''۔یہ مضمون بہت ہی مقبول ہوا۔اسے ڈاکٹر فیروز احمد نے اپنے مشہوراورمعیاری رسالے ''پاکستان فورم'' میں دوبارہ شائع کیا تھا۔پھر یہ کوئٹہ میں فصیح اقبال کے پرچے میں چھپ گیا۔اس کے بعد یہ جماعت اسلامی کے رسالے ''زندگی'' میں بہت تذلیل آمیز تبصروں کے ساتھ نمودار ہوا۔یہ مضمون بعد میں ایک کتابچے کی شکل میں شائع ہوا۔2005 میں چین کے اندراس کا چینی زبان میں ترجمہ شائع ہوا۔

اس کتابچے میں عبداللہ جان نے بلوچستان میں طبقاتی سماج کے وجود میں آنے اوراس کے ارتقا کا بہت خوب صورت تجزیہ کیا۔اس نے بالخصوص انگریز سامراج کے ہاتھوں سرداری فیوڈل نظام کے مضبوط ہونے کا عمیق مطالعہ کیا۔عبداللہ جان سرداری نظام کا بہت گہرا مطالعہ رکھتا تھا۔اپنے اس کتابچے میں وہ اس نظام کے ایک سردار کے بارے میں لکھتا ہے:

''ایک نواب صاحب تو ذہنی طور پر اس قدر ماؤف تھے کہ انہوں نے اپنی اولاد کو بھی

جدید تعلیم سے محروم رکھا۔ عقل کے اندھے یہ نواب صاحب نہ صرف جدید نظریات کو بلکہ کسی بھی جدید چیز کو اپنی ریاست کے حدود میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ جب بلوچستان میں پہلی مرتبہ سائیکل درآمد کی گئی تو نواب صاحب نے اپنی عمل داری میں اس کا داخلہ ممنوع قرار دیا۔ خود وہ اونٹ یا گھوڑے پر سفر کرتے تھے۔ جب بلوچستان میں موٹر کاریں عام ہوئیں تو نواب صاحب بھی مجبور ہوئے کہ ایک موٹر کار خریدیں تا کہ انگریز حاکم یعنی، ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل کی سلامی کے لیے وقتاً فوقتاً کوئٹہ جانے میں سہولت ہو۔ لیکن واپسی پر ریاست کے حدود میں داخل ہوتے ہی وہ کار بند کروا دی جاتی تھی۔ اور نواب صاحب اونٹ یا گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے صدر مقام پہنچتے تھے۔''(1)

اس کتاب کی ذیلی سرخیوں سے ہی اس کتاب کی علمی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

1۔ سرداری نظام

2۔ قبائلی سماج کے اصول

3۔ قبیلے کی شاخیں

4۔ قبائل کی اراضیات، مشترکہ ملکیت میں

5۔ سردار مستقل آبادیوں کا مالک

6۔ سرداروں کی اقتصادی حالت بہتر ہوگئی

7۔ سردار انگریزوں کے تنخواہ دار بن گئے

8۔ جاگیرداری نظام

9۔ نمایاں سماجی تبدیلیوں کا آغاز

10۔ انگریزوں کی آمد

11۔ ہر سردار سرِ دربار جھک کر لاٹ صاحب کو سلامی دیتا

12۔ سامراج اور سرداری نظام کا گٹھ جوڑ

13۔ شاہی جرگہ اور سالانہ دربار

14۔ بلوچستان لیوی اور پولیس

15۔ بلوچستان میں باہر سے آنے والے

16۔ سرداروں کی موقع پرستی

17۔ ذلت آمیز واقعہ پر شاعر کا ردِ عمل

18۔ ایک نئے شعور کا آغاز

19۔ برٹش راج سرداروں کا ابدی سایہ

20۔ بلوچستان میں سیاسی شعور کی ابتدا

بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلوچستان میں طبقاتی سماج پہ یہ اولین نثری تصنیف تھی۔ (شاعری تو رحم علی مری، یوسف عزیز مگسی اور گل خان نصیر کر چکے تھے)۔ یہ کتاب میر صاحب نے اُس وقت لکھی جب تحقیق کے لیے اتنے زیادہ منابع دستیاب نہ تھے۔ پیکولین اور گنگوفسکی کی کتابیں ابھی نہیں چھپی تھیں۔ ڈاکٹر فیروز، اعجاز اور اقبال احمد خان کی تحقیقی تحریریں ابھی موجود نہ تھیں۔ چنانچہ بلوچ طبقاتی سماج پہ عبداللہ جان کے پاس کوئی فریم ورک موجود نہ تھا۔ لہٰذا بلوچستان کو طبقاتی اُسی کا یہ کتابچہ گردانا جائے گا نکتہ نظر سے دیکھنے والا اولین دانش ور وہی ٹھہرا اور اس موضوع پہ پہلی تصنیف۔ اور طاہر بزنجو کی یہ بات تو سو فیصد درست ہے کہ اکثر و بیشتر مؤرخین لاٹ کی بگھی کو کندھے پر اٹھانے کے ناقابلِ فراموش واقعے کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سوائے عبداللہ جان جمالدینی کے کسی بھی بلوچ قلم کار کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اس ضمن میں کھل کر گفتگو کرے۔ حالاں کہ یہ واقعہ ''سرد خانے میں رکھنے کا نہیں ہے بلکہ نوجوان نسل کو بتانے کا ہے تا کہ وہ تاریخ کے اس سبق سے استفادہ حاصل کریں۔''(2)

حوالہ جات

1۔ جمالدینی۔ ع۔ ج۔ بلوچستان میں سرداری نظام۔2000۔ سید ہاشمی لائبریری کراچی۔ صفحہ 57

2۔ بزنجو، طاہر۔ ہم بابا بزنجو کا ذکر کیوں کرتے ہیں ''غیر مطبوعہ مواد سے''۔

مُرگِ مینا

میر عبداللہ جان کی کتاب ''مرگِ مینا'' 1993 میں شائع ہوئی۔120 صفحات پر مشتمل اس کتاب کو بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے شائع کیا۔ یہ دراصل ایک تحقیقی کتاب ہے جس میں اُس نے نوشکی کے درویش اور صوفی منش شاعر شیر جان کی شاعری کو اکٹھا کیا۔اس شاعر کو انتقال کیے ایک صدی بیت چکی ہے۔ جواں مرگ شیر جان، بلوچی زبان کا ایک بہت ہی باکمال اور رواں شاعر تھا ۔ایک ایسے دور کا شاعر جب انگیریز حاکمیت مسلط تھی اور اس کے خلاف زبردست عوامی مزاحمت جاری تھی ۔ یہ شاعر بھی عوام کے ساتھ ساتھ ان کے ہیروؤں کی تعریف و توصیف کرتا ہے اور بزدلوں اور غداروں کو برا بھلا کہتا ہے۔ جہاں عوام وہیں فقیر شیر جان۔اس کی شاعری کا جوہر نیک ،خیر خواہ اور انسانیت دوست لوگوں کی تعریف کرنا، ان کی شان بڑھانا اور برائی و بدی کو برا اور بد کہنا ہے۔

فقیر شیر جان کی شاعری کا دوسرا حصہ عشقیہ ہے ۔ اور وہ حصہ بھی بہت خوب صورت ہے۔ بہت ہی رنگین، بہت دلکش اور دل نشیں شاعری ہے۔

میر عبداللہ جان نے بڑی عرق ریزی سے ان کی شاعری کو جمع کیا۔اسے اس سلسلے میں کتنی مشکلات آئی ہوں گی، میر عاقل خان مینگل کی زبانی دیکھیے :

''بلوچی دیوان کے مضبوط رکن جناب پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی کو 1952 میں انہیں جمع کرنے اور چھان پھٹک کرنے میں جو محنت کرنی پڑی وہ تو اُسی زمانے کے ادیب ہی سمجھ سکیں گے۔ اُس زمانے میں ٹیپ ریکارڈر کی سہولت میسر نہ تھی ۔ جناب عبداللہ جان بلوچی ضرب الامثال ، کہانیاں، ڈرامے اور افسانے اور شاعری جمع کر رہا تھا ۔ حکومت کی طرف سے اسے مدد کی بجائے جیل خانے پیش کیے گئے اور اس کے ساتھیوں کو ڈرانے کا کام کیا جاتا تھا۔مگر یہ بہادر اور ہمت کا مالک مشکلات اور غربت کے باوجود بلوچی زبان کی خدمت سے پیچھے نہ ہٹا۔''(1)

میر عبداللہ جان نے نہ صرف اس شاعری کو اکٹھا کیا بلکہ اس کی ترتیب پر بھی کافی غور و خوض کیا۔ نیز اس نے حاشیوں میں مشکل الفاظ کے ترجمے اور وضاحتیں بھی دے دیں تا کہ قاری کو پڑھنے اور سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

اس کے علاوہ اس نے ہر نظم کا عنوان دیا۔ یہ تفصیل بھی دی کہ اس نے یہ نظم کس شخص سے سنی ،اُس شخص کی ولدیت کیا تھی اور وہ کہاں کا رہنے والا تھا۔

حوالہ

1۔مینگل، عاقل خان، پکیر شیر جان ئے شاعری۔ دیباچہ برائے کتاب مرگِ مینا۔
مصنف عبداللہ جان جمالدینی۔سال 1993۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ صفحہ نمبر 23

ماما بلوچی فوک شاعری چُنتا ہے

جیسا کہ ذکر ہوا، ایک بار وہ مکران گیا اور دنیا کو پہلی بار ملا فاضل جیسے بلوچی شاعر سے متعارف کرایا۔ عبداللہ جان نے مشرقی اور مغربی دونوں لہجوں کی بلوچی شاعری جمع کی۔ اسے ہمیشہ یہ اطمینان رہا تھا کہ اس کا مجموعہ Dames کے جمع کردہ مواد کے برابر کا ہے۔ اپنے مکران کے اس سفر کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

> ''مکران کے سیر سپاٹے نے میری زندگی کا ایک بڑا ارمان پورا کر دیا۔ بلوچی ادب کے بارے میں میری معلومات بڑھائیں۔ میر عیسیٰ قومی، حسن زرگر اور ملا اسماعیل جیسے نام ور شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات ہوئی اور ماہنامہ ''بلوچی'' کے لیے کچھ پیسہ بھی جمع ہوا۔ پسنی سے برادرم علی دوست نے مجھے بحری راستے پر روانہ کر دیا۔ یہ میرا پہلا بحری سفر تھا''۔(1)

میر عبداللہ جان جمالدینی نے کلاسیکی شاعری کے ساتھ ساتھ بلوچی فوک شاعری جمع کرنے کا کام بھی خوب کیا تھا۔ اور یہ کام بلوچستان کے طول و عرض میں جائے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ وہ خود وسطی بلوچستان سے تعلق رکھتا تھا جو لہجہ کے اعتبار سے مشرقی و مغربی دونوں لہجوں سے مختلف ہے۔

میر صاحب نے ایک طرف تو مکران جا کر ملا فاضل کی شاعری کو دریافت کیا تو دوسری طرف وہ مشرقی بلوچستان سے ''بُول والی''، مست کے اشعار' اور' ہڑب جنگ'' اور ''رنگی'' جیسی شاعری کی کھوج کرلایا۔ بلوچی زبان کو سٹینڈرڈائز کرنے کی خواہش رکھنے والے احباب کے لیے ایک مثالی اقدام!!۔

میں اس موضوع کو ماما کے اپنے الفاظ کے ساتھ بند کرتا ہوں:

> ''مست توکلی نے میرے جذبہ انسان دوستی کو اور بھی ابھارا''۔

حوالہ

1۔ جمالدینی، ع۔ ج ہفت روزہ عوامی جمہوریت لاہور 7 اپریل 1981 صفحہ 5

ہمارا بلوچستان

میر عبداللہ جان نے لالا غلام محمد شاہوانی سے مل کر ایک پمفلٹ ''ہمارا بلوچستان'' کے عنوان سے لکھا تھا۔

''جن لوگوں کی فرسودہ مزاجی، کوتاہ بینی اور قدامت پرستی نے اس سرزمین کے مصائب میں اضافہ کر دیا ہے ہمیں ان سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ بلکہ ہمارے مخاطب تو وہ جوان ہیں جنہیں مستقبل کی تاریکیوں میں اپنے وجود سے اجالا کرنا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ مسئلہ کی اہمیت اور اس کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے وہی راستہ منتخب کریں گے جو آگے کی طرف بڑھتا ہو''۔(1)

وہ اسی مضمون میں سچ کہنے کی اہمیت یوں بیان کرتے ہیں:

''دنیا میں سب سے بڑی جواں مردی یہ ہے کہ جب چند مفاد پرست افراد قوم کو گم راہی کے گڑھے میں دھکیلنا چاہیں تو اس وقت سینہ تان کر سچی بات کہہ دی جائے''۔(2)

''ہمیں اعتراف ہے کہ ہم اپنے چند دوستوں سے اختلاف اور خداوندانِ اقتدار کی منشا کے خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ جس سے ان کی جبینوں کا شکن آلود ہونا یقینی ہے..... .....ہمارے نزدیک اس خطہ ملک کے روشن مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ لسانی اور تہذیبی بنیادوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بلوچ قوم پر مشتمل بلوچستان کے نام سے ایک وحدت قائم کی جائے''۔

.....والیوں، نوابوں اور سرداروں کے امتیازی حقوق ختم کر کے ان کے وظائف بند کر دیے جائیں.....''۔

یہ دراصل بلوچستان کے مستقبل کے بارے میں لکھا گیا پمفلٹ ہے۔ اس کے اندر بادشاہت کی بجائے ایک ترقی پسند اور جمہوری بلوچستان کے قیام کی بات کی گئی۔ یہ دراصل ایک ایسے پمفلٹ کا جواب ہے جو مستقبل کے بلوچستان کو والیانِ ریاست کے حوالے رکھنے کی حمایت میں شائع کیا گیا تھا۔(دیکھیے ضمیمہ)۔

حوالہ

1۔ جمالدینی، عبداللہ جان اور شاہوانی، غلام محمد۔ پمفلٹ ''ہمارا بلوچستان''۔ دوبارہ شائع کردہ سنگت۔ کوئٹہ۔ ستمبر 2004 صفحہ 19

2۔ ایضاً

شخصیات پہ مضامین

ایک کتاب کی صورت اختیار کر سکنے کے قابل اس موضوع پر میر عبداللہ جان جمالدینی نے بہت کچھ لکھا۔ میر صاحب نے معروف ادبی سیاسی اور سماجی شخصیات کے خاکے اور ان کے کام کے بارے میں لکھا۔ اِن محترم شخصیات میں بابو عبدالکریم شورش، سوبھوگیان چنداڑیں، میر غوث بخش بزنجو، میر مٹھا خان مری، پروفیسر کرار حسین، آزاد جمالدینی، لوہسون، بالاچ گورگیژ، فقیر شیر جان، اور قاضی نذرالاسلام شامل ہیں۔

وہ ہر شخصیت کے ساتھ اپنی اولین ملاقات کا ذکر ضرور کرتا ہے۔ وہ تفصیل سے تذکرہ کرتا کہ یہ ملاقات کہاں، کس تحریر میں، کس شخص کی زبانی، کس طرح اور کس کس کے ہمراہ ہوئی، اس شخصیت نے کیا پہنا تھا، کس زبان میں باتیں ہوئیں اور کس موضوع کو زیرِ بحث لایا گیا۔ اس کے بعد وہ اُس شخص کی صفات، کارناموں اور سوانح کے بارے میں لکھتا ہے۔ وہ ان شخصیات کے خاندان اور علمی سماجی پس منظر بیان کرتا ہے۔ اُن سے وابستہ اپنی دیگر یادیں، ملاقاتیں بتاتا ہے. کبھی کبھی وہ ان شخصیات کے عہد کے سماجی سیاسی اور معاشی حالات کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔

یہاں بھی میر صاحب کی بے نظیر یادداشت ہی اس کا ہتھیار رہی۔

بابو عبدالکریم شورش کے ساتھ بھی اس نے یہی سلوک کیا۔ بالخصوص اُس کے اس رول کو اس نے بہت سراہا ہے جب اس نے کوئٹہ کی طوائفوں کے خلاف ایک بے مہار جلوس کے سامنے تن تنہا کھڑے ہو کر ان خواتین کو بے شرفی سے بچالیا تھا۔

میر مٹھا خان مری کے بارے میں عبداللہ جان جمالدینی کی یہ بات سو فیصد درست ہے کہ ''میر مٹھا خان بلوچی کے سب سے بڑے نثر نگار ہیں''۔ عبداللہ جان نے اُس پہ لکھے گئے اپنے مضمون میں شاعری کے بارے میں مٹھا خان کی جو رائے نقل کی وہ اس بڑے ادیب و دانش ور کی توقیر بہت بڑھاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''شاعری محض انسانی ضرورتوں کی داستان اور ذکر نہیں ہے۔ بلکہ شاعری خوش حال زندگی کو قائم رکھنے، یا پھر، خوش حال تر کرنے، اور ناخوش اور دکھی زندگی کو بدلنے کی ایک دانستہ اور رضا کارانہ کوشش ہے''۔(1)۔

بھلا مٹھا خان مری کو عبداللہ جان سے بہتر کون سمجھ سکا ہے؟ بھلا مٹھا خان مری سے بڑا ترقی پسند اور کون ہے قبیلے میں؟۔

میر غوث بخش بزنجو کے بارے میں تو اس نے بہت کچھ لکھا۔ ہماری دسترس میں اس کے دو ہی مضامین آئے۔ ایک کا عنوان ہے: میر غوث بخش بزنجو کی یاد میں۔ اور دوسرے کا: میر غوث بخش بزنجو۔

وہ اس کے ساتھ اپنی خوب صورت یادیں تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ سکول میں زمانۂ تعلیم سے لے کر میر بزنجو کی وفات تک ان کی یہ بے مثال رفاقت، باہمی احترام کے ساتھ جاری و ساری رہی۔ اختلافِ رائے، بحث مباحثہ، اتفاق و مناقشہ، لیکن کبھی بھی ایک دوسرے کے احترام میں کمی نہ آنے دی۔ بزنجو کے بارے میں اس کی رائے یوں ہے:

''میر غوث بخش بزنجو کو بلوچ رہنما کی حیثیت سے میر یوسف علی مگسی کے بعد سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ میر یوسف علی نے جس تحریک کا آغاز کیا تھا، میر غوث بخش نے اسے انتہائی احسن اور کئی گنا بڑھ چڑھ کر آگے بڑھایا اور ترقی دی۔ اس طرح موجودہ تاریخ میں سب سے

نمایاں اور بڑا نام غوث بخش بزنجو کا ہے۔

''میر صاحب میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو عصرِ جدید کے ایک ہر دل عزیز رہبر میں لازم ہوتی ہیں۔ وہ فطرتاً آزاد منش انسان تھے۔ اور انسان دوستی ان کے خمیر میں ودیعت تھی۔ نہایت ہی بردباری کے ساتھ بے حد نڈر اور حق بات کہنے سے کسی بھی بڑی شخصیت سے مرعوب ہونے والے نہ تھے۔ جو سیاسی راہ اور مسلک انہوں نے منتخب کیا، تا دمِ مرگ اس پر ثابت قدم رہے۔ کبھی بھی ان کی استقامت میں لغزش نہیں آئی''۔

''اس کا دمکتا چہرہ میں کبھی نہیں بھول سکتا'' کے عنوان سے میر صاحب نے جس ہستی پر ایک بہت ہی دلکش مضمون لکھا، اس کا نامِ گرامی غلام محمد شاہوانی تھا۔ وہ بلوچستان کا بہت ہی حق گو، بے باک اور غریب دوست صحافی تھا۔ اس کے اخبار پر پابندی لگا دی گئی اور اسے چھ ماہ کی سزا ہوگئی جس کے پورا ہونے پر ایک ہزار کا جرمانہ بھی ادا کرنا تھا، بصورت دیگر تین ماہ مزید جیل بھگتنا تھا۔ ماما اپنے اس کامریڈ کے لیے یوں لکھتا ہے:

''غلام جان کو جیل سے رہائی دلانے کے لیے ایک ہزار روپے کا بندوبست کرنا ہم جیسے تنگ دست لوگوں کے لئے بہت بڑا مسئلہ تھا۔ بھیک مانگنے کے علاوہ کوئی راہ نہ تھی۔ گرتے پڑتے بمشکل کراچی پہنچا۔ مال و دولت اور امیروں ساہوکاروں کے اس شہر میں مجھ جیسا بے سروساماں انسان دو ہفتے کی بھاگ دوڑ کے بعد صرف ساڑھے چار سو روپے جمع کر سکا۔ اس غلام جان کے لیے جو مجھے اور میرے ساتھیوں کو دنیا بھر کی دولت سے پیارا اور عزیز تھا۔ بھلا سرمایہ دار غلام جان کے لیے پیسہ دے بھی کیسے سکتے تھے۔ دشمن کے لیے کس کا دل دکھتا تھا؟''۔(2)

ماما کو غلام جان اس لیے اچھا لگتا تھا کہ:

''اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اپنے پسماندہ اور بھوکے عوام کی زندگیاں یکسر بدل دی جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ کئی راہیں ڈھونڈتا اور ان پر بحث کرتا۔''(3)

پھر اپنے اسی محبوب دوست کی موت پہ عبداللہ جان یوں نوحہ خواں ہوتا ہے:

''2 ستمبر 1958 کو میں صبح سویرے نوشکی روانہ ہوگیا۔ رات گھر میں گزاری اور صبح میرے نام ایک ضروری تار آیا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے جلدی جلدی لفافہ پھاڑا اور تار پڑھی: ''غلام جان فوت ہوگئے''۔ اَنجم

''میری دنیا اندھیر ہوگئی۔ میری آنکھیں برسات کی طرح آنسو بہا رہی تھیں۔ میں بہت رویا۔ گھر کے افراد نے مجھے روتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی رونے لگے۔ جب میں نویں جماعت میں تھا، اُس وقت میرے والد فوت ہو گئے۔ اُس وقت میرے آنسو کسی نے نہیں دیکھے۔ لیکن اب انہوں نے آنسو دیکھے۔ سمجھ گئے کہ اس کا دوست، گہرا دوست، سب سے شیریں ساتھی غلام جان کا انتقال ہوگیا''۔(4)

میر صاحب نے آزات جمالدینی کی زندگی اور جدوجہد کے بارے میں ایک بہت ہی طویل مضمون (آزات کی شاعری کے مجموعے کے دیباچے کے بطور) لکھا۔ اسی طرح سوبھوگیان چندانڑیں کے بارے میں راقم الحروف کی کتاب ''موہن جودڑو کا جوگی'' کے پیش لفظ میں تیس صفحات پر مشتمل ایک طویل مضمون لکھا۔

بلوچستان میں علم کے فروغ میں بے مثال خدمات سرانجام دینے والا ہمارا ایک محسن پروفیسر کرار حسین تھا۔ اس کے بارے میں میر صاحب نے یوں لکھا:

''ان کی موت پاکستان کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ مجھے اس بات سے بہت دکھ ہوا۔ مذہبی منافرت اور دہشت گردی کے دوران جب ایک مجرم کو گرفتار کیا گیا تو اس کے بیان کے مطابق اس کی تنظیم نے اُسے تربیت کے لیے افغانستان بھجوادیا تھا اور بعد میں اس نے بتایا کہ اس کا پروگرام تھا کہ کرار حسین، ادیب رضوی کو قتل کردے۔ اس طرح ہمدرد یونیورسٹی کے تعمیر کرنیوالے مرحوم حکیم سعید کو قتل کر دیا گیا اور عبدالستار ایدھی کی موت کے درپے تھے۔ یہ انسان دشمنی ہے۔ ایسے سماج میں کیا ترقی ہو سکے گی جس میں انسانوں کی بھلائی سوچنے والوں کا، یا عمل کرنے والوں کا یہ انجام ہو''۔(5)

جاگیرداروں اور ملاّؤں کی جانب سے اپنے بھائی کے سر کی قربانی دینے اور خود 75 کوڑے کھانے والے فیوڈل دشمن تاجک ادیب اور استاد ملاّ صدرالدین عینی پر بلوچی میں میر عبداللہ جان ہی نے بہت ہی خو b صورت مضمون لکھا۔ عینی کی پُر درد زندگی، اس کے مطالعہ کی عادت، اور پھر اس کی کتابوں کے بارے میں عبداللہ جان نے بہت محنت سے معلومات دی ہیں۔ بلاشبہ بلوچی زبان میں صدرالدین عینی پر یہ اولین، اور اب تک کی آخری تحریر ہے۔

عبداللہ جان نے بلوچی کے قدیم شاعر ودانش ور ملاّ فاضل کی قبر ڈھونڈنے مکران کے دور افتادہ گاؤں مند تک کا سفر کیا۔ اور بالآخر وہ قبر ڈھونڈ نکالی اور اس کی زیارت کی۔ اس سفر کو اس نے ''فاضل ئے زیارت'' کے نام سے قلم بند کیا۔ اس کی بلوچی تحریر کس قدر رواں اور دلچسپ ہوتی ہے، آیئے میں اسی مضمون کے ابتدائی پیراگراف کا ترجمہ کیے دیتا ہوں:

''ڈاک لاری سوئی ہوئی تھی یا چل رہی تھی..... رات تاریک تھی اور سوائے سڑک کے نہ ختم ہونے والی لکیر اور اس کے دونوں اطراف درختوں کے، اس کے جھٹکوں کے' کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا میں تاریکی کی حکمرانی ہے اور اگر زندگی کا کوئی وجود ہے تو اسی ڈاک لاری اور اس کی سواریاں ہیں۔ لیکن جب ہم ایک ندی میں سے گزرے اور کھجوروں کی گھنی قطاروں سے باہر نکلے تو کتوں کے بھونکنے، غریب بلوچوں کے گھروں کے چولہوں کی آگ کی روشنی، بکریوں کے لیلوں کے ممیانے، انسانی بولنے اور بچوں کے رونے کی آوازوں نے ہمارے خیال کو باطل کر دیا''۔(6)

کھوجی عبداللہ جان نے بالاچ گورگیژ کی ایک طویل شاعری ڈھونڈ نکالی۔ وہ اپنے بلوچی مضمون ''بالاچ گورگیژ'' میں بالاچ کی شاعری کے بارے میں یوں کہتا ہے:

''بالاچ اولین دور کے ایک اچھے شاعر ہوگزرے ہیں۔ رنگی یا جنگی واقعات کو بیان کرنے اور منظر کشی، بلند خیالی، اپنے بلوچی رسم ورواج کے اندر کی مثالیں دینا، روانی، اشعار کی ہم

وزنی وبرابری اس کے اشعار کی خصوصی صفت ہے۔ ایک ناخواندہ چرواہا بھی اس کے مطلب ومعانی سمجھ سکتا ہے''(7)۔

میر عبداللہ خان جمالدینی نے نوشکی کے رنگین طبع شاعر فقیر شیر جان کے متعلق بڑی جانفشاں تحقیق کی ہے۔ اس کے مضمون ''فقیر شیر جان'' میں شیر جان کی زندگی کے دلچسپ واقعات، اس کی شاعری کے نمونے اور اس شاعری پہ عبداللہ جان کا تبصرہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

ہماری عمر کے بلوچوں کی اکثریت نے بنگال کے قومی شاعر قاضی نذرالاسلام کی شاعری کے نمونے کا بلوچی ترجمہ اس کی زندگی کے مختصر احوال کے ساتھ ماما ہی کے قلم سے پڑھا ہے۔

میر عبداللہ جان جمالدینی نے بلوچی زبان ہی میں چین کے انقلابی ادیب اور افسانہ کے بادشاہ لوہسون کے فن اور زندگی کے بارے ایک طویل اور بھرپور مضمون لکھا۔ لوہسون پر بھی اس کا مضمون بلوچی زبان میں اولین مضمون تھا۔ (سچی بات یہ ہے کہ وہی مضمون اب تک آخری بھی ہے)۔

ماما نے حیدر نامی ایک غریب کی بیماری، موت اور تدفین کے بارے میں تفصیل سے بلوچی زبان میں لکھا۔ اس کا افسانہ نما یہ مضمون بیسویں صدی کے زوال پذیر کوئٹہ کا آنکھوں دیکھا حال لگتا ہے۔ بلاشبہ عبداللہ جان کو بلوچی پہ مکمل عبور حاصل تھا۔ اس قدر بھرپور انداز تحریر بہت سنجیدہ قرات کی دعوت دیتا ہے۔ آخری پیراگرف کا اردو ترجمہ دیکھیے:

''ہم نے اپنے ساتھی حیدر کو اپنے ہاتھوں سے نہلایا اس لیے کہ جنت کی حوروں اور بنگلوں پر دعویٰ رکھنے والے ملاّ نے اسے غسل دینے سے انکار کر دیا۔ کالج کے کچھ انگلش پڑھنے والے لڑکوں نے بلوچی سٹریٹ کے غریبوں کے ساتھ حیدر کی میت کاندھوں پہ اٹھائی اور قبرستان پہنچائی.....''۔

حوالے

1۔ جمالدینی، عبداللہ جان، میر مٹھا خان مری غیر مطبوعہ مواد سے

2۔ جمالدینی، ع۔ج۔ عوامی جمہوریت لاہور۔ 7 اپریل 1981 صفحہ 5

3۔ ایضاً

4۔ ایضاً صفحہ 7

5۔ جمالدینی، عبداللہ جان ''پروفیسر کرار حسین کی یاد میں'' ماہنامہ سنگت کوئٹہ ستمبر 2004۔ صفحہ 58

6۔ جمالدینی، ع۔ج۔ فاضل ئے زیارت۔ غیر مطبوعہ مواد سے

7۔ جمالدینی۔ ع۔ج، بالاچ گورگیژ۔ غیر مطبوعہ مواد سے

کتابوں پر تبصرے

ایک کتاب بھر مضامین کا مواد، اس موضوع پر موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دعویٰ بلاوجہ نہیں ہے کہ میر عبداللہ جان نے بلوچی ادب کے لیے بہت کام کیا۔ اس نے سب بلوچ ادیبوں کی بہ نسبت نیا اور انوکھا کام یہ کیا کہ بہت عرصہ تک بلوچی میں شائع ہونے والی کتابوں پہ تبصرے لکھے۔ رسالہ ''بلوچی'' میں اس کا ''کتابانی سراچمشا نک'' (کتابوں پر تبصرہ) نامی ایک مستقل عنوان ہوا کرتا تھا۔ اور وہ ہر ماہ ایک نئی کتاب پہ نئے انداز سے تبصرہ لکھتا۔ وہ روایتی انداز میں آغاز کرتا تھا۔ جس میں وہ کتاب کا نام، مصنف کا نام، کتاب کی ضخامت، قیمت اور پبلشر کا نام دینے کے بعد مضمون شروع کرتا ہے۔ میر عبداللہ جان صرف کتاب پر ہی تبصرہ نہیں کرتا بلکہ وہ جان بوجھ کر بہت ہی فن کاری کے ساتھ بلوچی ادب کی مختلف اصناف کے ارتقا کی کہانی، بلوچ پبلشنگ کی حالت اور دیگر فنونِ لطیفہ کی حالت بھی بیان کرتا جاتا۔

توار

میر عبداللہ جان، محمد حسین عنقا کی شاعری کی کتاب ''توار'' کے بارے میں لکھتے ہوئے عنقا صاحب کا تعارف یوں کراتا ہے:

''محمد حسین عنقا ان لوگوں میں سے ہیں جو ہماری قومی ترقی

اورشعور بڑھانے اور ہماری آج کی قومی نام وآواز کا سنگ بنیاد رکھنے
والوں کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔اس نکتے کو یادرکھنا چاہیے کہ
عنقا صاحب کی شخصیت کے اسی پہلو کونظرانداز کیا جاتا رہا ہے''۔

یہیں پر میر صاحب بلوچی صحافت کی تاریخ کی درستگی کرتے ہوئے یہ دلچسپ بات بتاتا ہے کہ بلوچی کے مشہور ماہنامہ ''اومان'' سے بھی قبل یعنی 1948 میں عنقا صاحب بلوچی ہفت روزہ ''بولان'' نکالتے تھے۔یوں عنقا صاحب نثر نگاری کے اولین نامعلوم سپاہی تھے۔

رحیلِ کوہ

بہت سے لوگوں کے لیے یہ بھی نئی بات ہے کہ اُس کی بلوچی شاعری سے بہت پہلے یعنی 1939 میں عنقا صاحب کا اردو مجموعہ کلام ''رحیل کوہ'' کے نام سے مارکیٹ میں موجود تھا۔اب یہ دونوں انکشافات بذاتِ خود بہت بڑے ہیں۔اور ایسے انکشافات تو عبداللہ جان جیسا محقق ہی کر سکتا تھا۔

میر عبداللہ جان، محمد حسین عنقا کی شاعری پر جامع تبصرہ کرتے ہوئے اس کا یہ شعر بھی پیش کرتا ہے:

نیل ایث گوں سواس ماں لو غاوتی کدی
سردارئے گس مسیتے ٹھان انت پر اُس

ترجمہ:

وہ بوسیدہ جوتوں کے ساتھ کبھی بھی اپنے گھر جانے نہیں دیتا
سردار کا گھر مسجد بنتا جاتا ہے عوام کے لیے(1)

درون

آدم حقانی کے شعری مجموعے ''درون'' پہ تبصرہ کرتے ہوئے وہ ایک اور اہم بات بتاتا ہے۔وہ اس نام کے بارے میں بتاتا ہے کہ ''درون'' جاہو کے قریب ایک مشہور پہاڑ ہے جہاں

کے مناظر بہت خو b صورت ہیں۔یہ بات بتا کر اس نے گویا ایک بڑی نیکی کی وگرنہ ہر بلوچ ڈکشنریاں لیے بیٹھتا اور ''درون'' کے معانی ڈھونڈنے میں سرگرداں رہتا۔

آدم حقانی' بلوچی کا جو لہجہ استعمال کرتا ہے اس کے بارے میں میر صاحب کا کہنا ہے کہ یہ لہجہ پنجگور سے لے کر جاہو تک، اور چاغی، خاران اور آواران تک پھیلا ہوا ہے۔

''سرداروں کے ظلم، جرگہ کی بے انصافیوں، کسان اور چرواہے اور مزدور کی زندگی کی مشکلات ومصائب ان کی شاعری کی بنیاد ہیں''۔

حقانی نے غزل بھی بڑی خوب صورت کہی۔وہ اس کا یہ شعر پیش کرتا ہے:

وہدے کہ رنج ایت گرنچوئے ہر دینکہ بشکند یت گُلے
قدا پہ سر وو سمبلے ترانا پہ باغہ بلبلے

ترجمہ:

ناراض ہوتی ہے تو غنچہ بن جاتی ہے مسکراتی ہے تو گل
قد میں سرو وسمبل ہے، گفتار میں باغ کا بلبل(2)

ہینار

عباس علی زیبی کے شعری مجموعے ''ہینار'' پر تبصرہ کی ابتدا وہ شاعر کے تعارف، یا اس کے کلام پر تبصرے کے بجائے، یوں کرتا ہے: ''کتاب کا ٹائٹل بہت خو b صورت ہے جسے مشہور فن کار اور خوش نویس احمد شاہ نے تیار کیا ہے۔کتاب کی خوش نویسی کا کام عیسیٰ سربازی نے کیا۔اس کا گیٹ اپ اور کاغذ خوب صورت ہیں۔اور یہ بلوچی کتابوں کی اشاعت کا ایک خوب صورت نمونہ ہے''۔یوں ماما مصنف اور کتاب کی آڑ میں آرٹسٹوں اور آرٹسٹ کتاب کی تیاری کے بارے میں آگاہ کرتا رہتا ہے۔یہ گویا خوش نویسی کے فن کا تذکرہ بھی ہے اور قدر دانی بھی۔

میر عبداللہ جان نے اس کی شاعری کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس پہ تنقید بھی کی ہے۔اور یہ ایک انوکھی بات ہے۔عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ میر عبداللہ جان صرف اور صرف حوصلہ

افزائی کرتا تھا۔مگر اس کا یہ پیراگراف اس عمومی تاثر کی کتنی بڑی نفی کرتا ہے:

''زیمی جلد باز شاعر ہیں۔جلد گو شاعر۔حالاں کہ ان کے موضوع، اور عنوان پہلی ہی مرتبہ متوجہ کر لیتے ہیں مگر شاعری زحمت کشی مانگتی ہے۔گفتگو اور شاعری میں بہت فرق ہوتا ہے..... میری زیمی صاحب سے درخواست ہے کہ وہ محنت کریں۔ان کے اندر شاعری کا جوہر موجود ہے.....''(3)

زردئے ارمان

''زردئے ارمان'' عنایت اللہ قومی کا شعری مجموعہ ہے جسے عزت اکیڈمی پنجگور نے شائع کیا تھا۔ماما نے کتاب پر تبصرہ تو کیا مگر یہاں بھی وہ ایک اور کمال کرتا ہے۔وہ کتاب پر تعارف سے قبل عزت اکیڈمی کا تعارف کرتا ہے:

''پنجگور کے عزت اکیڈمی نے ''زردئے ارمان'' شائع کر کے اپنے مقامی شہ نویسوں اور شاہ گفتاروں کی بڑی قدر و منزلت کی۔اکیڈمی نے اپنا نام ''عزت'' کے بڑے اور پیارے نام سے جوڑ دیا۔اور جس طرح عزت، مہرک پہ شیدا تھا۔اکیڈمی نے عزت کے liے اپنی شیدائی ثابت کر دی''۔

ماما نے کتاب میں عنایت اللہ قومی کی طرف سے بچوں کو دیے ہوئے پیغام کا خصوصی تذکرہ کیا:

''قوم کے بچوں کے لیے ان کا پیغام یہ ہے کہ وہ شعور حاصل کریں۔اس پیغام سے بہتر پیغام اور کیا ہو سکتا ہے۔بچوں کو اگر شعور و علم حاصل ہو جائے تو پھر قومی ترقی ناگزیر ہو جاتی ہے اور یہ روشن خیال شعور، زندگی کے مسائل و مصائب با آسانی حل کر سکے گا اور زندگی کو روشن اور خوش حال بنا سکے گا''۔

ماما نے عنایت اللہ قومی کے مندرجہ ذیل چند مصرعے نمونے کے بطور دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ قومی صاحب کی زبان کس قدر خوب صورت اور رواں ہے:

زری نوذاں پذا رنگے بیارنت
دمانے کھچرو زیداں بہ گوارنت
زریث پہ ملگزاراں زندگیں دل
شمئے وہدیں شما کمیں گوارنت
زر ئے سر گواث کاریت چندئے بو
شما پلانی بو آں وش بیارنت

ترجمہ:

سمندری بادلو! ایک بار پھر ترنگ میں آؤ
ذرا سا چراگاہوں وادیوں پہ برسو
میرا زندہ دل، سبزہ کے لیے بہت اداس ہے
یہ تمہارا موسم ہے ذرا سا برس جاؤ
سمندری ہوائیں چندن کی خوشبو ساتھ لاتی ہیں
تم پھولوں کی خوش بو بکھیر جاؤ(4)

گچین گنج

میر عبداللہ جان نے ڈاکٹر فضل خالق کی ترجمہ کردہ کتاب ''گچین گنج'' پر بھی نہایت جامع تبصرہ کیا ہے۔جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ میر عبداللہ جان نے اپنی ان تحریروں میں بہت منصوبہ بندی سے، سوچ سمجھ کر بلوچی ادب و ثقافت کے کسی نہ کسی شعبے پہ خصوصی توجہ دی ہے. ''گچین گنج'' نامی ترجمے کی کتاب پہ تبصرہ کرتے ہوئے اس نے بلوچی زبان میں ترجمے کی اہمیت و افادیت پہ مختصر مگر بہت جامع انداز میں اظہار کیا ہے۔

ہم اس کتاب پہ اس کے تبصرے پر بات کرنے سے پیشتر ترجمہ کے بارے میں اس کے خیالات یہاں نقل کرتے ہیں:

''ادب میں ترجمے کے مقام کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، حالاں کہ ترجمے کی اہمیت فہمیدہ اور دانش مند لوگوں کے نزدیک بہت بلند ہے اور یہ کام ادب کی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔ بلکہ بہت سے دانش ور تو ترجمہ کو اگر وہ واقعی اچھا ہو اور جلوہ ناک ہو، ایک تخلیقی کام گردانتے ہیں۔ ہمارے علم و دانش کی وسعت اور گہرائی اصل میں ادب کے ان ترجمہ نگاروں کی مرہونِ منت ہے۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے اور ان کی دانش ورانہ محنت نہ ہوتی تو ہم آج کس طرح ہومر کے ایلیڈ اور اوڈیسی کے بارے میں، گوئٹے کے فاؤسٹ، شکسپیئر کے ہیملٹ اور اسکائیلس کے پرومی تھیس کے بارے میں جانتے۔ گریک مائتھالوجی کی حسین اور عجیب دنیا کے بارے میں اگر ہم جانتے ہیں تو وہ اسی علمی و ادبی ترجمہ کی بدولت ہے۔ ہم اگر سقراط، افلاطون اور ارسطو کے دانش و فلسفہ کے بارے میں جانتے ہیں تو انہی لوگوں کی قلمی کاوشوں کے احسان مند ہیں۔ آج اگر دنیا اور ہمارے افکار روشن ہیں تو یہ انہی علمی نور پھیلانے والوں کے احسانات ہیں۔(5)

میر عبداللہ جان نے ترجمے کے بارے میں ایک اور اہم مضمون ''ادبی تراجم کی افادیت'' کے اندر نہ صرف تفصیل سے ترجمہ کی عمومی تاریخ بیان کی بلکہ اس نے بالخصوص بلوچی ترجمہ کی تاریخ و ارتقا پہ تفصیلاً لکھا۔ بہت محنت سے اس نے بلوچی ترجموں کی وہ لمبی فہرست مرتب کر دی جو اب تک ہماری زبان میں اپنی طرز کا ممتاز اور یکتا تحقیقی کام ہے۔ گو کہ یہ کام 1983 تک ہے اور اسے اپ ٹو ڈیٹ کرنا ضروری ہے لیکن 1983 تک یہ فہرست بہت مکمل اور جامع ہے۔(6)

میر صاحب آگے لکھتا ہے:

''فضل خالق نے اس کتاب میں ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ اور یورپ کے ان ادبی شہہ پاروں کو پیش کیا ہے جو آزادی، خوش حالی اور امن کے لیے انسانی جدوجہد کے بارے میں ہیں۔ فضل نے ان ادیبوں کا انتخاب کیا ہے جنہوں نے اپنی خوشیاں، آرام اور زندگیاں قربان کر کے انسانی زندگی کے اندر تاریکیوں کو ختم کر دیا''۔

ماما کے بقول،

''یہ چھوٹی سی کتاب محبت، آزادی، جمہوریت، اتفاق، انسانی برابری اور امن کے بارے میں دنیا کے اچھے انسانوں کے فکر اور شاعری کا خزانہ ہے جو بلوچی جیسے ترقی پذیر ادب کی بروقت ضرورت کو پورا کرتی ہے''۔

وہ اپنے اس تبصرے کو فضل خالق کی زبان کی روانی، ترجمے کے ابلاغ اور بلوچی زبان کی صحت کے بارے میں اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اس نعرے پر ختم کرتا ہے:

''بلوچی زبان سبز باد''۔

الہان

میر عبداللہ جان جمالدینی نے عباس علی زیمی کی نثری شاعری کی کتاب ''الہان'' پر تبصرہ کرتے ہوئے دراصل نثری شاعری کی اہمیت کے بارے میں خوب صورت اظہار کیا ہے:

''نثری شاعری بہت سی زبانوں کے ادب میں مقبول ہوئی اور بہت سارے لوگوں نے اس میدان میں شہرت پائی مثلاً مشہور جرمن فلسفے کی مشہور کتاب ''زرتشت نے کہا'' نثری شاعری کی ایک زبردست تخلیق ہے۔ مگر اسی بارے میں عالمی ادب میں بڑا نام عربی کے لازوال ادیب خلیل جبران کا ہے۔ خلیل جبران کی کتابیں بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوگئی ہیں''۔

بلوچی زبان میں نثری شاعری کی تاریخ کے بارے میں ماما کے دلائل بہت اہم ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ یہ صنف بلوچی زبان میں نسبتاً نئی ہے۔ اس سے قبل غزل تھی اور پھر پابند نظم۔ اس کے بعد آزاد نظم شروع ہوئی جس کی سربراہی آزات جمالدینی اور عطا شاد نے کی۔ بلوچی میں نثری شاعری کا آغاز سب سے پہلے غلام فاروق نے ''آشوب'' کے نام سے خلیل جبران کا ترجمہ شائع کر کے کیا۔ پھر جناب نعمت گچکی نے اس صنف میں کاوشیں کیں اور اس کے بعد عباس علی زیمی کی کتاب ''الہان'' شائع ہوئی۔(7)

گور بام

بشیر بیدار کے مجموعہِ کلام ''گور بام'' پر تبصرہ کرنے سے قبل میر عبداللہ جان جمالدینی بشیر بیدار کی شاعری میں سے یہ ٹکڑا نقل کرتا ہے:

وہدے سباہ بیگاہ بیت
دل موسماں بیگواہ بیت
زند ئے عجب راہ انت گران
کئے گوں کئے آ ہمراھہ بیت
امروز ئے غم لال ئے حیال
اینکس چطور یکجاہ بیت

ترجمہ:

جب صبح شام ہوجاتی ہے
دل موسموں میں گم سم ہوجاتا ہے
زندگی کی راہیں عجیب مشکل ہیں
کون کس کے ہم راہ ہوجاتا ہے
امروز کے غم محبوبہ کا خیال
ا تنا کچھ کیسے یک جا ہوسکتا ہے

ماما کا یہ فقرہ بہت غور طلب ہے کہ ''بشیر بیدار جتنا بڑا ہے اتنی ہی اس کی کتاب چھوٹی ہے۔'' وہ بشیر کی شاعری کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے شکایت آمیز انداز میں اس کی بے پرواہی، بے خیالی اور لاابالی پن کا تذکرہ کرتا ہے۔ شاعر کی اس بے پرواہی کو وہ بلوچی شاعری کا بڑا نقصان قرار دیتا ہے۔ اور واقعتاً وہ صحیح کہتا ہے۔

بشیر بیدار بہت ہی اچھا شاعر ہے۔ روان، گہرا، پر معنی، اور رنگین شاعر۔ بلوچی زبان کو اس پر بجا طور پر فخر ہے:

منّاں کہ من ہچے نہ اوں
تو نیستی ئے نامامہ دئے
ہر کس گوشیت بلّے گشیت
دلبر ترا باید نہ انت
مس چہ تئ پلیں دفا
دژ نام و بد ہم واڑتگوں
سکّیں دمان و ساعتاں
دیتگ ترا پد کنزغا
انگت منی کرپاس ئے پل
مس چہ وثی زیمیں دلا
روچے نہ کث افارگے
کم زانگیں ماہ ئے لقا
اینکس ترا زانگ بہ بیت
ہر کس گوشیت بلے گشیت
دلبر ترا باید نہ انت

ترجمہ:

مانتا ہوں کہ میں کچھ بھی نہیں
(مگر) تم مجھے ''نیستی'' کا نام نہ دو
دوسرے جو کہتے ہیں پرواہ نہیں
دلبر تم تو ایسا نہ کہو
میں نے تمہاری خوب صورت زبان سے
دشنام سہے، برا بھلا سہا

مشکل اوقات وساعتوں میں
تجھے پسپا ہوتے بھی دیکھا
پھر بھی اے میرے کپاس کے پھول
میں نے اپنے زخمی دل سے
ایک دن بھی اف نہ کی
نادان ماہ لقا
اتنا تو تجھے معلوم ہونا چاہیے
دوسرے جو کہتے ہیں پرواہ نہیں
دلبر تم تو ایسا نہ کہو

نوکیں تام

''نوکیں تام'' وہ انتخاب ہے جو بلوچی شاعری میں سے غلام فاروق نے کر کے شائع کی۔ یہ کتاب 1981 میں چھپی تھی مگر کسی نے اس پر تبصرہ نہ کیا اور عبداللہ جان نے سات سال بعد 1988 میں پہلی بار اس کتاب پر قلم اٹھایا۔ اس شعبے پر بھی تحقیق ماما نے ہی کی:

''اب تک اس طرح کے شعری انتخاب تین بار شائع ہوئے ہیں۔ پہلا انتخاب 1959 میں شائع ہوا جس میں نئی شاعری کی ابتدا یعنی محمد حسین عنقا سے لے کر ملک طوقی اور اکبر بارکزئی شامل تھے۔ دوسرا انتخاب عطا شاد نے شائع کرا دیا جس میں مختلف شعرا کا کلام شامل ہے۔ پہلے والے انتخاب کا نام ''مستاگ'' تھا اور دوسرے کا ''گشین شاعری''۔ تیسرا انتخاب یعنی'' نوکیں تام'' میں بشیر بیدار سے لے کر منصور بلوچ تک کا کلام شامل ہے۔ یہ گویا نئے دور کی تیسری نسل کے شعرا پر مشتمل ہے۔''(8)

****

میر عبداللہ جان نے ایک بلوچی رسالے کے سالنامے پر بھی تبصرہ لکھا۔

کاش کہ کوئی ادارہ میر صاحب کی ان تمام تخلیقات کو ik جا کر کے کتابی صورت دے دیتا، تاکہ تحقیق کاروں کو ان بکھری ہوئی تحریروں کو ڈھونڈنے اور ان سے استفادہ کرنے میں اتنی مشکل نہ ہو۔

حوالہ جات

1۔ جمالدینی۔ع۔ج۔''کتابانی سراچمشانک''۔ماہنامہ بلوچی کوئٹہ۔ستمبر 1987۔ صفحہ 186

2۔ایضاً۔۔۔۔اکتوبر 1987۔صفحہ 91

3۔ جمالدینی۔ع۔ج۔ایضاً نومبر 1987 صفحہ 64

4۔ جمالدینی۔ع۔ج۔ایضاً دسمبر 1987۔صفحہ 74

5۔ جمالدینی۔ع۔ج۔ایضاً فروری 1988 صفحہ 49

6۔ جمالدینی ع۔ج ''ادبی تراجم کی افادیت'' کتاب ادبی زاویے 1983۔ اکادمی ادبیات پاکستان۔صفحہ نمبر 213

7۔ جمالدینی ع۔ج ایضاً جون 1988 صفحہ 83

8۔ جمالدینی۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔اگست 1988 صفحہ 65

متفرق مضامین

عبداللہ جان منظر کشی بہت دلکش کرتا تھا۔

''چہ ریک ئے سرا'' اس کا بہترین بلوچی مضمون ہے۔ وہ اس مضمون میں تاجکوں اور ازبکوں کے ملک سے جہالت، بھوک اور غربت کے کُوچ کر جانے کی بات کرتا ہے۔ نوشکی اور سوویت یونین کے نظام ہائے زندگی کا باہمی تقابل کرتا ہے۔ وہ یہ تقابل پڑوسی ملک ایران سے بھی کرتا ہے۔ وہاں کے عوام میں بیداری کی لہر کا خصوصی طور پر ذکر کرتا ہے اور اپنے وطن بلوچستان میں موجود سرداری نظام کو کوستا ہے۔

عبداللہ جان 1953 میں اپنے افسانے ''نیستگاریں لوگ'' میں نازو کی زبان سے بلوچ معاشرے کی خوب صورت عکاسی کرتے ہوئے ترقی پسند ادب کی تخلیق میں اپنا حصہ ڈالتا ہے۔

اس نے بہت ہی خوب صورت بلوچی میں ایک مضمون ''صحب ئے استار'' (صبح کا ستارہ) لکھا جو بہت ہی دلچسپ ہے۔ انداز وہی جبران والا، کہیں کہیں سلیمان لائق سے ملتا جلتا۔ صبح کا ستارہ تو ہمارے روشن فکر ادیبوں کا جانا پہچانا انقلاب کا استعارہ ہے۔ ماما تو انقلاب کو رجھاتا ہے، پرچاتا ہے، اس کی منتیں کرتا ہے، اسے ترغیب دیتا ہے، اس کے لیے اپنی جان و مال کی قربانی کا عہد و پیمان کرتا ہے۔

''بلوچ قوم: عہدِ قدیم سے عصر جدید تک'' نامی میری کتاب کے دیباچے میں اس نے بہت ہی خوب صورت فقرہ استعمال کیا جسے ہر جگہ دہرانے کی ضرورت ہے: ''انسان وہی اچھا، اور عالم و دانش ور وہی قابلِ احترام ہوتا ہے جو سب انسانوں کا بھلا چاہتا ہو۔'' (1)۔

میر صاحب بلوچستان میں بالخصوص نسل پرستانہ اور انتہا پسندانہ ماحول کا سخت مخالف تھا۔ وہ اپنے صوبے میں قومی و نسلی اقلیتوں کے حقوق کا علمبردار رہا ہے۔

اس نے بے شمار کتابوں کے پیش لفظ لکھے ہیں۔ عبداللہ جان بلا شبہ چھوٹے اور نو آموز لکھاریوں کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی کرنے میں گنیز بک میں درج کرنے کے قابل ہے۔

اپنے ایک طویل اور پھر پور مضمون ''پاکستانی معاشرہ اور بلوچی ادب'' میں اس نے لکھا کہ:

> ''تخت جمشید بہشتون، اور نقشِ رسم کی تحریروں سے پتہ چلا ہے کہ بلوچی قدیم فارسی زبان سے ملتی جلتی ہے اور ماہرین لسانیات اسے پہلوی سے قبل کی زبان، قدیم ایرانی کی ہم عصر بتاتے ہیں۔'' (2)

جیسے کہ ذکر کیا گیا ہے کہ بلوچی ادب کی مختلف اصناف پہ عبداللہ جان کی نگاہ ہمیشہ گہری رہی ہے۔ اس نے ''بلوچی افسانہ کا ارتقا'' کے عنوان سے بلوچی میں ایک مضمون لکھا تھا۔ جس میں اس نے بلوچی افسانہ کے ارتقا کو بلوچی لوک کہانیوں سے نہیں بلکہ بیرونی ادب کے افسانوں کا نتیجہ قرار دیا۔ اس کی تحقیق کے مطابق بلوچی میں پہلے پہل اردو اور انگلش افسانوں کے ترجمے ہونے لگے۔ اس کے بعد کہیں جا کر آہستہ آہستہ بلوچی افسانہ لکھنے کا رواج پڑتا گیا۔ شروع شروع میں ایسی سب تحریریں رومانی داستانیں تھیں، جن کا پلاٹ بہت کم زور تھا۔ ان میں نہ تو کلائمکس کا خیال رکھا جاتا تھا اور نہ منظر نگاری کی جاتی تھی۔

عبداللہ جان بلوچی افسانے کے ارتقا میں دو چیزوں کو بڑی اہمیت دیتا تھا؛ ایک تو بین الاقوامی ادب کے ترجمے اور دوسرے بلوچی میں شائع ہونے والے رسائل و جرائد۔ بالخصوص آزاد جمالدینی کے رسالہ ''بلوچی'' نے بلوچی افسانے کی ترویج اور ترقی میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

میر عبداللہ جان ''راھبند'' کے عنوان سے بلوچی زبان میں لکھنے والوں کو بہت اچھی

نصیحتیں کرتا ہے۔ وہ انہیں زبان سے محبت کرنا، منصوبہ بندی سے کام کرنا اور مل جل کر اتفاق سے کام کرنا سکھاتا ہے۔

عبداللہ جان لوگوں کے مضامین کی چھان پھٹک کرتا تھا۔ وہ مختلف مصنفین کی کتب کے مسودوں پر نظر ثانی کرتا تھا۔ اس کی اصلاح و استادی صرف تحریروں تک ہی محدود نہیں ہوتی بلکہ لوگوں کے ذاتی خاندانی معاملات تک جا پہنچتی تھی۔ لوگ اپنے نومولود بچوں کی پیدائش پر اسے فون کر کے بچے کا نام تجویز کرنے کی درخواست کرتے تھے۔ جی ہاں، میر عبداللہ جان اپنے عزیزوں رشتہ داروں حتیٰ کہ دیگر قبائل کے احباب کی اولاد کے نام رکھتا رہا تھا۔

میر صاحب ترقی پسند ادب کا رہنما رہا ہے۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے بلوچی ادب کو ترقی پسندی کے معراج تک پہنچایا۔ وہ بلوچستان میں پراگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کی تمام سرگرمیوں کا کمان دار رہا تھا۔ اس نے قدیم بلوچی شاعری پہ بہت تحقیق کی۔ مکران سے لے کر مریوں کے علاقے تک وہ گھوم گھوم کر شاعری اکٹھی کرتا رہا تھا۔ کہیں اپنے نام سے، اور کہیں کسی اور قلمی نام سے اسے شائع کرواتا رہا۔

ماما نے توکلی مست، جام درک، رحم علی اور جوانسال جیسے کلاسیکل بلوچی شاعروں کے بارے میں لکھا۔ اس نے بلوچی پشتو، سندھی اور پنجابی ادب کے مسائل پر عالمی اور ملکی سیمیناروں میں بے شمار مقالے پڑھے۔ اردو میں، بلوچی، براہوئی اور پشتو میں۔ وہ ان تمام زبانوں سے محبت کرتا تھا اور ساری زندگی ان کے فروغ کے لیے کام کرتا رہا۔

اس نے بے شمار کتابوں کے دیباچے لکھے اور ایسے خوب صورت اور مفصل دیباچے لکھے کہ کبھی کبھی اصل کتاب پر بھاری ہو جاتے۔ مثال کے طور پر اس نے بلوچی کے ممتاز شاعر جناب اکبر بارکزئی کی شاعری کی کتاب ''روچہ کئے کشتہ کنت'' کا جو دیباچہ لکھا وہ پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں شاعر کی اپنی سوانح حیات کے علاوہ اس کی شاعری پر بہت خوب صورت اور علم افروز تفصیل لکھی۔

خود اکبر بارکزئی نے اس کے دیباچے کے بارے میں اس طرح اقرار کیا:

''میں اپنے بھائی اور ساتھی واجہ عبداللہ جان جمالدینی کا بہت شکر گزار
ہوں کہ اس نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا
پیش لفظ میرے اشعار سے زیادہ پڑھنے کے قابل ہے''۔(3)

جمالدینی صاحب نے اپنی زندگی کے اوائل یعنی بچپن اور ابتدائی لڑکپن کے بارے میں چار پانچ مضامین ''زندگی نامک'' کے عنوان سے بلوچی زبان میں لکھے۔ اس کا ارادہ اُسے آخر تک لکھنے کا تھا تاکہ اس کے زمانے کے ثقافتی اور تہذیبی گردوپیش کے بارے میں معلومات ہوں۔ اس نے بہت خوb صورتی سے رواں بلوچی میں اُس وقت کے معاشی سماجی حالات بیان کیے۔ البتہ وہ اس سلسلہ کو بوجوہ جاری نہ رکھ سکا اور اسے نامکمل چھوڑ دیا۔

میر عبداللہ جان نہ صرف بلوچی، اردو، فارسی اور پشتو زبان و ادب پر عبور رکھتا تھا بلکہ وہ براہوئی زبان و ادب کا بھی استاد تھا۔ براہوئی اس کے اپنے چاغی ضلع میں بڑے پیمانے پر بولی بھی جاتی ہے۔ اور وہاں ہر گھر میں بلوچی اور براہوئی دونوں، مادری زبانوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ عبداللہ جان نے اپنے طویل مضمون ''براہوئی شاعری'' کے لوک گیت کی بنیاد وطن دوستی کو قرار دیا ہے۔ یہ وطن دوستی خانہ بدوش زندگی سے مزید گہری اور مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ براہوئی شاعری کے اندر وطن اور وطن سے متعلق مظاہر، مقامات اور جذبات کو خوب پذیرائی نصیب ہوئی ہے۔ سامراج دشمنی دراصل وطن دوستی ہی کی پیداوار ہوتی ہے۔ عبداللہ جان نے براہوئی کلاسیک سے لے کر فوک تک اور پھر جدید شاعری تک اسی وطن دوستی کو جاری و ساری دیکھا:

''وطن سے محبت اور لگاؤ نے ہمارے عوام کو وہ جذبہِ آزادی بخشا ہے کہ وہ ہمیشہ اس کے لیے جان کی قربانی دیتے رہے ہیں۔ ہمارے عوام کی قربانیوں کی داستانیں انہی وطن دوستانہ شاعری میں محفوظ ہیں۔ چنانچہ انگریز حملہ آوروں کے خلاف جب نورا، یا، خان محراب خان شہید نے جان کی بازی لگادی تو شعرا نے ان مجاہدین اور سورماؤں کی شان میں نظمیں لکھیں''(4)۔

نومبر 1982 کے ''اولس'' پشتو میں ماما عبداللہ جان نے پشتو اور بلوچی لسانی رشتوں کے حوالے سے ایک مقالہ پشتو میں لکھا تھا۔ بہت ہی خالص اور رواں پشتو میں۔ یہ خالص تحقیقی مقالہ

ہے جس میں اِن دو قوموں کے عوام کے رہن سہن ، رسم و رواج اور سود و زیاں کے اشتراک کی بدولت ان دو زبانوں کی قربت کی سائنسی توجیح دی گئی ۔ میر صاحب نے اِن باہم بہن زبانوں کے مشترک الفاظ کی ایک لمبی لسٹ بھی مہیا کی ۔

اس کا ایک بہت ہی خو b صورت اور طویل مضمون ماہنامہ {اولس} کے مارچ 1991 کے شمارے میں ''بلوچی آزمانکئے دیرئی'' کے نام سے موجود ہے ۔ جس میں اس نے بلوچی افسانہ کی ابتدا سے لے کر 1991 تک کا ایک بہت ہی اچھا تجزیہ پیش کیا ہے ۔ بلوچی افسانے کو درپیش مسائل سے لے کر اِس کے ارتقا و ترقی سے متعلق ہر پہلو کو بہت توجہ اور انہماک سے بیان کیا ہے ۔ میر عبداللہ جان جمالدینی بلوچی ادب کا دائی تھا ۔ اُسے ہمارے ادب میں تخلیق کے درد کی ایک ایک لہر کا پتہ تھا اور وہ اِس تحریری بلوچی ادب کے ایک ایک پل کا ساتھی تھا ۔ ہمت بڑھانے والا ، حوصلہ دینے والا اور تخلیق شدہ فن پاروں کا ڈھنڈورہ کرنے والا ۔ ماما ہماری تاریخ میں بلوچی ادب کا سب سے بڑا دوست رہا تھا ۔

اسی طرح میر عبداللہ جان نے ریڈیو کے لیے بے شمار مضامین اور سکرپٹ لکھے ۔ جو اداروں کی تباہ حالی کے باعث ریسرچرز کو دستیاب نہیں ہیں ۔

حوالہ جات

1 ۔ جمالدینی ۔ دیباچہ ''بلوچ قوم عہدِ قدیم سے عصرِ حاضر تک'' ۔

2 ۔ جمالدینی ، عبداللہ جان ۔ پاکستانی معاشرہ اور بلوچی ادب ۔ ماہنامہ سنگت کوئٹہ ۔
جنوری 2005 صفحہ 7

3 ۔ بارکزئی ، اکبر ۔ ''روچا کئے کشت کنت'' ۔ 1988 ۔ آزات جمالدینی اکیڈمی ، کراچی صفحہ 67

4 ۔ گل ہنگلزئی ۔ دیباچہ جمالدینی کی کتاب ''براہوئی شاعری میں وطن دوستی'' ۔ ماہنامہ سنگت کوئٹہ

تراجم

میر صاحب نے بے شمار سیاسی مضامین کا ترجمہ کرنے کے علاوہ گورکی ، ٹالسٹائی اور چیخوف کی کئی کہانیوں کے ترجمے کیے ۔

اس نے روسی افسانہ کے درخشاں ستارے انتون چیخوف کے ایک افسانے کا ''لیب'' کے عنوان سے خوب صورت ترجمہ کیا ۔ اسی طرح ٹالسٹائی کا ''نیستگاریں لوغ'' بھی ماما کا کیا ہوا خوب صورت بلوچی ترجمہ کیا ہے ۔

اس نے گورکی کے ایک کتابچہ My Interviews سے ایک انٹرویو کا ترجمہ کیا جو وہ امریکہ میں تیل کے ایک بادشاہ سے لیتا ہے ۔ یہ انٹرویو بہت ہی دلچسپ ہے ۔ اس کا یہ ترجمہ روزنامہ امروز لاہور میں ''تیل کے بادشاہ'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا ۔

دیہات کے غریب

یہ لینن کی لکھی کتاب To The Rural Poor کا اردو ترجمہ ہے ، جو 1950 کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں شائع ہوا ۔ یہ کتاب ہم نے 2003ء میں بہت ہی دیدہ زیب انداز میں دوبارہ چھاپی ۔ یہ کتاب لینن نے 1903 میں روس کے دو اضلاع میں برپا شدہ کسان بغاوت کے بعد لکھی تھی ۔ قریب قریب سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کا ترجمہ اپنی روانی ، زبان کی سادگی اور

فقروں میں ربط اور ہم آہنگی کے لحاظ سے بہت معیاری ہے۔ انقلاب سے قبل روس کی دیہی فیوڈل زندگی حیرت انگیز طور پر ہمارے آج کے معاشرے سے ملتی جلتی ہے۔

عبداللہ جان نے سیاسی سماجی کارکنوں اور لیڈروں کو باشعور بنانے کے عزم کے ساتھ اس کتاب کا خوب صورت ترجمہ کیا تھا۔ اس کتاب کا بعد میں روس میں بھی اردو ترجمہ کیا گیا۔ مگر ماما عبداللہ جان کا کیا گیا ترجمہ اس سے بہت اچھا ہے۔

پروفیسر عرفان احمد بیگ کے بقول، ''اس کتاب کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے محترم عبداللہ جان جمالدینی نے لینن کی کتاب کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ لینن نے خود اردو میں 'دیہات کے غریب' کے عنوان سے کتاب لکھی ہے''۔(1)

حوالہ

1۔ بیگ، عرفان احمد ''دیہات کے غریب'' ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔ جولائی 2003۔ صفحہ 82

ناپسندیدہ باتیں

سن 2001 میں عبداللہ جان نے مضامین کا ایک اور سلسلہ ''ناپسندیدہ باتیں'' کے عنوان سے لکھنا شروع کیا جو کہ ماہنامہ ''سنگت'' میں چھپنے لگا۔

یہ علم پروری و انسان دوستی کے موضوع پر سلسلہ وار مضامین تھے۔ عبداللہ جان زندگی بھر علم حاصل کرنے، علم دینے اور علم کی اہمیت جتانے کا مقدس کام کرتا رہا۔ ان مضامین میں بھی اس نے اسی سماجی ذمہ داری کو نبھایا۔

''ناپسندیدہ باتیں'' میں سے ایک مضمون کی ذیلی سرخی ہے:

سرداریت + ملّائیت = جہالت و غربت۔

ظاہر ہے کہ سارا مضمون اسی موضوع سے متعلق ہے۔ ہم یہاں مضمون کی آخری تین سطریں نقل کرتے ہیں:

''جمہوریت کے ملغوبہ اور کھچڑی میں مافیا، ہیروئنی، اور سمگلر سب شامل ہوئے۔ سردار اور ملّا دونوں کی یہ ضرورتیں ہیں۔ سرمایہ اور ہتھیار انہی کی توسط سے ان بدخوا نسانوں کو میسر ہیں۔

''ملاؤں نے عقیدہ کے نام پر فریب دے کر ووٹ لیے۔ سردار، خان اور وڈیرہ نے قومی آزادی کے نام پر''۔

اس سلسلہ ہائے مضامین میں اس نے ابنِ عربی، ابنِ سینا، ابنِ رشد، اور الفارابی جیسے روشن فکر اور خرد افروز حکما اور سائنس دانوں کی عظمت بیان کی۔ یورپ کے رینے ساں کا تذکرہ کیا۔ کوپرنیکس اور ڈارون کی بلند قامتی لکھی۔ اس نے عبدالقدیر خان وثمر مبارک کا تقابل ضمیر نیازی سے کیا اور ظاہر ہے کہ ضمیر نیازی کی کتاب ''زمین کا نوحہ'' کو ہر لحاظ سے افضل قرار دیا۔

اس مضمون کی دوسری قسط مکمل طور پر ڈاکٹر امیر الدین کی اخلاقی جرأت، نظریاتی کمٹ منٹ اور جدوجہد پر وقف کی ہوئی ہے۔

اس عنوان کا تیسرا مضمون اگر ایک طرف افغانستان میں امیر امان اللہ خان کی روشن فکری کی توصیف میں ہے، تو وہیں طالبان کی بنیاد پرستی اور رجعت پسندی پہ شدید تنقید سے مزین بھی ہے۔ اور اس پورے افغان کھیل میں امریکہ اور یورپ کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ عبداللہ جان افغانستان کی بربادی پہ بہت دکھی تھا۔

ہم، بدقسمتی سے ''ناپسندیدہ باتیں'' کی صرف تین قسطوں کے قاری بن سکے ہیں۔ وہ اپنی بیماری کے سبب یہ سلسلہ مزید جاری نہ رکھ سکا۔

لَٹ خانہ

پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی نے ''لٹ خانہ'' تحریک کی تاریخ کے بارے میں اپنی یہ کتاب قسطوں میں لکھنا شروع کی تھی۔ یہ قسطیں ماہنامہ ''نوخیس دور'' میں شائع ہونے لگی تھیں۔ یہ سلسلہ 1995 کے اواخر تک چلا۔ اس کے بعد جب ماہنامہ ''سنگت'' کا اجرا ہوا تو 1997 کے اواخر میں یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔ ''لٹ خانہ'' نامی یہ سلسلہ رسالے میں قارئین کی پسندیدہ ترین تحریروں میں سے ایک رہا۔

سال 2000 میں جا کر یہ سلسلہ تکمیل کو پہنچا۔ تب سوا دو سو صفحات کی یہ کتاب ہم نے چھاپی، بہت دیدہ زیب اور اپنے مافیہ کے شایانِ شان فارمیٹ اور گیٹ اپ کے ساتھ۔ اس کتاب میں، میر صاحب نے اپنی سوانح عمری، (بالخصوص کالج لائف کے بعد کے دس برس کے عرصے کے بارے میں) لکھی۔ اس نے اپنے دوستوں اور مخالفوں کے بارے میں بہت تفصیل دی۔ اس زمانے کے نظریات اور ادب کے بارے میں لکھا اور اور بلوچستان کی اُس زمانے کی سیاست پر مفصل بحث کی۔

''لٹ خانہ'' 1950 کی دہائی میں سیاست و ادب سے متعلق ان ملی جلی یاداشتوں سے عبارت ہے جن کی بنیاد اس وقت کے ابھرتے ہوئے دانش ور طبقہ نے رکھی۔ اُس دور کے عوامی

مطالبات، حکومتی تضادات، معاشی عدم مساوات اور دستوری حقوق کی جدوجہد کا آغاز ''لٹ خانہ'' کے آئینہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ترقی پسند طرزِ فکر نے اس تحریک کو ایک نیا سماج مرتب کرنے کے اصول عطا کیے، سرمایہ دارانہ نظام تعلیم اور سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کے فلسفہ کی فرسودگی سے اسے ذہنی اور فکری بالیدگی ملی۔(1)

اس کتاب کو ملک بھر کے اہلِ قلم نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

''یہ کتاب اردو لٹریچر میں ایک اہم اضافہ ہے۔ یہ لٹریری تحریک کی تہذیبی تاریخ اور لٹریچر کا ریکارڈ فراہم کرتی ہے جس نے کہ بلوچستان کو متاثر کیا۔ یہ کتاب کراچی اور بلوچستان کے بلوچ ادیبوں کے ذریعے بلوچی لٹریچر کی ترقی کے بارے میں بہت کچھ واضح کرنے کے ساتھ بلوچی ادب وصحافت کی ترقی میں لیاری کے اہلِ قلم کے کردار کو سامنے لاتی ہے۔ کوئی اور کتاب بلوچی طرز زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کی معاشرت پر معاصر مصنفین کے اثرات و کردار کے بارے میں اس سے بہتر آگاہ نہیں کرتی۔ عبداللہ جان جمالدینی نے اپنی جوانی کے بیشتر ایام کراچی میں گزارے۔ اس شہر میں ان کے دوستوں کا ایک حلقہ اچھے رائٹروں پر مشتمل تھا۔ جمالدینی صاحب نے اپنی کتاب ''لٹ خانہ'' میں ان کی یادیں اس طرح سمیٹی ہیں کہ پڑھنے والا ان کے اس دور کا شریک بن جاتا ہے''۔(2)

یہ کتاب بڑی تکریم اور شوق سے پڑھی گئی اور آج یہ کتاب ہر اچھی لائبریری میں موجود ہے۔ اس کتاب کو دوسری بار 2013 میں شائع کرنا پڑا، اس لیے کہ یہ نایاب ہوگئی تھی۔ بہت کم عرصے میں اس کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن بھی ختم ہو چکا اور اب یہ، بارِسوم اشاعت کے لیے تیار ہے۔

حوالہ جات

1۔غوری، بیرم۔''لٹ خانہ۔ایک ایریل ویو'' ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔اگست 2002 صفحہ 50۔

2-صدیقی، محمد علی۔روزنامہ ڈان کراچی۔28 مئی 2003۔

شمعِ فروزاں

(2006)

عبداللہ جان جمالدینی نے ''ایک شمع فروزاں'' کے عنوان سے ماہنامہ ''سنگت'' میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ جس میں 1985 میں کراچی میں منعقد ہونے والی ترقی پسند ادیبوں کی گولڈن جوبلی کانفرنس کا تفصیلی بیانیہ موجود ہے۔

یہ ایک لحاظ سے بذاتِ خود ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔ اس میں اس کانفرنس کی تیاریوں، بلوچستان سے ایک بہت بڑے وفد کی اس میں شرکت کے سارے مراحل، اور خود کانفرنس کی روداد بہت تفصیل اور باریکی سے بیان کی گئی ہے۔ ہر مرحلہ کی تفصیل، شریک افراد کے بارے میں تذکرہ اور پڑھے گئے مقالوں کے بارے میں رائے بہت خوب صورتی سے دی گئی۔ بالخصوص کانفرنس کے روحِ رواں لوگوں کے بارے میں عبداللہ جان کی تحریر ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلاشبہ عبداللہ جان رپورتاژ لکھنے کا ماہر تھا۔

''شمع فروزاں'' نامی سلسلہ ہائے مضامین میں اِس گولڈن جوبلی کانفرنس کے بعد پیپلز پارٹی کے دور میں فخر زماں کی طرف سے منعقد کردہ ''جمہوریت پسند مصنفین کانفرنس'' کی بھی پوری روداد موجود ہے۔ ماما خود بھی اس کانفرنس میں شریک ہوا تھا اور ایک خوب صورت مقالہ پڑھا تھا۔

مزاحمتی ادب اس پوری کانفرنس کا مرکزی تھیم تھا۔

پروین شاکر کی کتاب ''گوشۂ چشم'' میں اس کانفرنس کی روداد بیان کرتے ہوئے اس کا نچوڑ یوں لکھا تھا:

''اچھا ہوا عبداللہ جان جمالدینی نے یہ کہہ دیا کہ ادب تو ہوتا ہی مزاحمتی ہے''۔(1)

ایسا تھا ہمارا ماما عبداللہ جان۔

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ ماما کی یادداشت قابلِ رشک اور بے نظیر تھی۔ ایک ایک تفصیل، ایک ایک واقعہ نہایت واضح انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس کانفرنس کے آخر میں بلوچستان یونیورسٹی کے بہت ہی اعلیٰ پائے کے استاد اور عالمی سطح کے دانش ور پروفیسر مجتبیٰ حسین کی ٹریفک حادثے میں الم ناک موت کو عبداللہ جان نے اس کتاب میں بہت افسوس اور دکھ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

''شمع فروزاں'' نامی اسی کتاب میں اس نے بلوچستان کے ایک اور محسن کی زندگی اور خدمات کا بہت باریکی اور احترام سے ذکر کیا ہے۔ وہ اچھا انسان ڈاکٹر امیر الدین تھا۔ عبداللہ جان نے اس ہیرے سے جان پہچان، اس سے اپنی اولین ملاقات اور اس کی علمی وثقافتی خدمات کا نہ صرف تفصیلی ذکر کیا بلکہ کھلے دل کے ساتھ اعتراف بھی کیا۔ عبداللہ جان اس قدر اپنائیت سے ڈاکٹر امیر الدین کی خدمات کا تذکرہ کرتا ہے کہ ہم تمام احباب امیر الدین سے اپنی دوستی پہ فخر محسوس کرتے ہیں۔

اسی کتاب ''شمع فروزاں'' ہی میں وہ خود پر فالج کی بیماری کے حملے کی پوری کہانی بتاتا ہے۔ ایسا وہ اپنے مخصوص سٹائل میں کرتا ہے، جس میں انسان دوستی، ساتھیوں کی حوصلہ افزائی، اور عالمگیر محبت بھری ہوئی ہے۔ عبداللہ جان اپنی بیماری کی تفصیل، علاج معالجہ کے سارے مدارج، عیادت کے لیے آنے والوں کی تفصیل اور اپنے معالجوں کا ذکر بہت وقار اور احترام سے کرتا ہے۔

یہ کتاب ایک لحاظ سے لٹ خانہ کا تسلسل ہے۔ جس میں عبداللہ کے فکری سفر کی پوری

روداد موجود ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر ''لٹ خانہ'' 1950 کی دہائی کا رپورتاژ ہے تو ''شمع فروزاں'' 1980 کے بعد کے 25 برسوں کا تذکرہ ہے۔ اگر درمیان والے تیس برس کی کڑی بھی لکھی جائے تو نہ صرف عبداللہ جان کی زندگی کی کہانی مکمل ہو جائے گی بلکہ بلوچستان کی روشن خیال تحریک کی مکمل تاریخ بھی سامنے آجائے گی۔

''شمعِ فروزاں'' 2006 میں ''سنگت اکیڈمی آف سائنسز'' کی طرف سے شائع کی گئی۔ سنگت اکیڈمی ہی اب اس کی دوسری اشاعت کر رہی ہے۔

حوالہ

1۔ پروین شاکر۔ گوشۂ چشم۔ سال 2000۔ پروین شاکر ٹرسٹ اسلام آباد۔ صفحہ نمبر 09

طرزِ تحریر

عبداللہ جان نے بہت کچھ لکھا۔ بہت زبانوں میں لکھا، اور بہت سے موضوعات پہ لکھا۔ مامانثر نگار تھا۔ اس نے سوانحی مضامین سے لے کر عالمی ادب تک بہت سے موضوعات پہ قلم اٹھایا۔ اس کی تحریر کی ایک خصوصیت تو بہت ہی ممتاز ہے۔ وہ یہ کہ عبداللہ جان کا انداز بہت سادہ ہے۔ وہ نرم و ملائم لہجہ رکھتا ہے..... بولنے میں بھی اور لکھنے میں بھی۔ اس کے فقرے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ وہ موٹے اور ثقیل الفاظ استعمال نہیں کرتا تھا۔ سی آر اسلم کی طرح عبداللہ جان کے لکھنے کا انداز عوامی تھا۔ عوام ہی سے تو وہ مخاطلب ہوتا تھا۔ انہی کے لیے تو وہ لکھتا تھا۔

عبداللہ جان اپنا مضمون ایک کہانی کی طرح تسلسل میں لکھتا تھا۔ کہیں بھی قاری کی دلچسپی ختم یا کم ہونے نہیں دیتا۔ اور جب لگے کہ بات طویل ہوگئی تو بیچ بیچ میں خوش گوار جملوں کے ذریعے مضمون میں جان ڈالتا تھا:

> ''بعد میں ایسا ہی ہوا جب ہم بخشا پور پہنچے شام کو برکت علی آزاد نے اس چھوٹے سے بازار کے چوک میں تقریر کی۔ اس کے مقابلے میں زمیندار علی بلاول خان ڈومکی تھا۔

''آزات صاحب نے زمینداری نظام کے خلاف تقریر کی۔تھوڑی دیر میں
بلاول خان کے چچا نے لوگوں کو جمع کر کے ہمیں مارنے کی کوشش کی۔ میں،
اور خدائیداد آزات کے پاس کھڑے تھے اور انہیں بچانے کی کوشش کر رہے
تھے۔ بہر کیف ہم بچ گئے۔لیکن برکت علی آزاد صاحب الیکشن میں کامیاب
نہیں ہوئے۔ایک اور امیدوار مشہور سیاسی لیڈر محمد امین کھوسہ تھے جو یوسف
علی خان عزیز مگسی کے کسی وقت انتہائی گہرے دوست ہوا کرتے تھے، وہ بھی
الیکشن کے دن بخشاپور میں موجود تھے۔ جب بیلٹ باکس کھولے گئے تو سب
سے زیادہ ووٹ علی بلاول ڈومبکی کے تھے۔اس کے بعد برکت علی آزاد کے
تھے۔ اس وقت شاید ہر امیدوار کا بکسہ علیحدہ ہوتا تھا۔محمد امین خان کھوسہ
کا بکس جب کھولا گیا تو ان کے اہم مددگار پیر صاحب پرچنڈی موجود تھے۔
بکس میں شاید ایک یا دو بیلٹ پیپر نکلے۔ اور ہم سب نے محمد امین کھوسہ کو
زور سے کہتے سنا ''انالِلّٰہ وانا الیہ راجعون''۔

بہت دلچسپ بات ہے کہ ماما کی اردو میں تذکیر و تانیث کی غلطیاں نہیں ہوتی تھیں۔ وگرنہ بلوچ تو اردو کے اندر لکھتے ہوئے تبدیلیِ جنس کا سپیشلسٹ بن جاتا ہے۔آریائی زبانیں ماسوائے جانداروں کے دیگر تمام مظاہر کی تذکیر و تانیث کے جھمیلے میں نہیں پڑتیں۔اپنے اسی پس منظر کے ساتھ بلوچ لکھاری جب بھی اردو میں لکھے گا، اس میں مذکر کو مؤنث بنا ڈالنے اور مؤنث کو مذکر میں بدل ڈالنے کا رفاہی کام ضرور کرے گا۔ ماما جیسے نیک انسان نے البتہ ایسا بہت کم کیا۔

ماما کی تحریر میں علمیت بہت زیادہ ہوتی ہے اور لفاظی بہت کم۔نیکی اور خیر کا پرچار آپ کو اس کے ہر مضمون کے ہر پیراگراف میں ملے گا۔وہ ہر جگہ بڑے بڑے مصلحوں، فلاسفروں اور نیک انسانوں کا ذکر کرتا ہے۔وہ اُن کے اقوال واشعار کے حوالے دے گا۔وہ خود ستائش کبھی نہیں کرتا۔ ہمیشہ دوسروں کی توصیف کرتا تھا، اُن کی اچھائیاں بیان کرتا تھا۔خود پہ تو کبھی کبھی طنز بھری تنقید کر جاتا تھا۔ دوسروں کے کام کا اعتراف اور خود پرستی سے فرار بہت خوب صورت سماجی رویوں کو جنم دیتے ہیں۔

عبداللہ جان موضوع کے اندر رہتا تھا۔وہ اِدھر اُدھر بھٹکتا نہ تھا۔اس طرح ایک تسلسل برقرار رہتا ہے۔اپنے بے پناہ علم کو اپنے قابو میں رکھنا ہی تو اچھے دانش ور کی علامت ہوتی ہے۔

اسی طرح میر عبداللہ جان کی بلوچی تحریر بہت مزیدار ہوتی ہے۔عبداللہ جان کو اپنی قومی زبان بلوچی سے بہت محبت تھی۔ وہ ساری زندگی بلوچی کی ترقی میں لگا رہا۔بلوچی کلاسیکل ادب کو جمع کرنے سے لے کر بلوچی رسالہ کی اشاعت تک، اور ریڈیو، ٹی وی میں لے جانے سے لے کر بلوچی قاعدہ نویسی تک عبداللہ جان ہر شعبہ میں موجود رہا۔اسے کبھی بھی بلوچی میں الفاظ کی کمی کا سامنا نہ ہوا۔اسے بلوچی ضرب الامثال، استعاروں اور تشبیہات پہ عبور حاصل تھا۔وہ بہت رواں، سہل اور عام فہم بلوچی لکھتا تھا۔ وہ اپنے مضمون کی اٹھان بہت رنگین، جاذبِ نظر اور دلچسپ انداز میں کرتا تھا۔مثلاً بلوچی کشیدہ کاری کے بارے میں اپنے مضمون ''بلوچی دوچ'' میں اس خوبصورت ثقافتی ورثے کی شروعات یوں کرتا ہے۔

''لڑکپن (کمسنی) کی باتیں انسان کے دل پر نقش ہو جاتی ہیں.....
مجھے وہ صبح ابھی بھی اچھی طرح یاد ہے۔ وہ ساون کے مناظر بھرے دن
تھے۔ بادل جو ہر شام برسا کرتے تھے اب اپنا وقت بدل چکے تھے۔
اب وہ صبح سویرے ایک برسات دے کر چلے جاتے تھے۔ایک صبح پالتو
(عادی) بارش برسی اور صبح کی خوبصورت ہوا چلنی شروع ہوئی۔آسمان
صاف ہوا۔گھر کے آگے ہر روز کی بارشوں سے ایک تالاب سا بن گیا
تھا۔کمرے کے سامنے سائے میں ایک چٹائی پر ماہ گل بیٹھی کشیدہ کاری
کر رہی تھی.....''(1)

حوالہ

1۔ جمالدینی عبداللہ جان ''بلوچی دوچ'' ماہنامہ سنگت کوئٹہ اکتوبر 2002۔صفحہ 25

شخصیت

ہمارا ایک کلاس فیلو تھا، وجیہہ خوب صورت اور خوش پوش۔ عجب دلچسپ شخص تھا۔ اُس کی ایک عجیب عادت تھی۔ وہ سامنے والے کی تعریف خوب کرتا تھا۔ خواہ اس میں خوبی ہوتی یا نہیں۔

میرا ایک بگٹی کلاس فیلو اتنا زیادہ غریب نہیں تھا، مگر شہری دنیا سے سراسر ناواقف تھا۔ دو تین جوڑے ہی لباس کے ہوتے تھے۔ ایک بار اس دیہاتی کی ملیشیا کی قمیص کہنی سے پھٹ گئی تھی اور اس نے سوئی دھاگے سے اس پہ چھوٹا سا پیوند لگایا۔ اس تعریف کرنے والے ہمارے کلاس فیلو نے بگٹی کے اس پیوند کو دیکھا تو بڑی تعریف کی: ''کمال کا رفوگر ہو، ظالم سیکھا کہاں سے؟'' وغیرہ، وغیرہ۔ وہ تو بعد میں پتہ چلا کہ بگٹی نے کالے رنگ کے ملیشیا پہ جو پیوند لگایا تھا، اس پہ جو دھاگہ استعمال کیا تھا، وہ سرخ رنگ کا تھا۔ شہر میں تو یہ بہت اجڈ پنا تصور ہوتا تھا۔ مگر اس نے تعریف کرنی تھی، کر دی۔

ماما عبداللہ جان ایک بہت بڑے فرق کے ساتھ میرے اس کلاس فیلو سے سوگنا زیادہ تعریف کرتا تھا۔ وہ آپ کی صلاحیتیں بڑھانے کے لیے آپ کی تعریف کرتا تھا۔ میں اب بھی اُسے سامنے محسوس کر رہا ہوں کہ وہ کس طرح میری حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔

حوصلہ افزائی کرنے کی اس کی عادت بہت نرالی تھی۔ وہ اختلاف تو بہت مدہم انداز میں کرتا تھا لیکن تعریف وتوصیف بہت بلند اور علی الاعلان کرتا تھا۔ اس کا محبت سے بھرا دل حسد اور جلن کی طرف آمادہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ کسی بھی قسم کے تعصب کو پیروں کے تلے روندتا گزرتا، ہر طرح کے شاؤنزم سے پاک تھا۔ وہ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی صلاحیت ضرور دیکھتا اور پھر اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہتا تھا۔ بے شمار لوگوں کو اس نے لکھنے پر آمادہ کیا۔ بلوچستان میں کوئی ایسا لکھاری، شاعر اور فن کار نہ ہوگا جسے عبداللہ جان کی حوصلہ افزائی کی مہمیز نہ ملی ہو۔

میر عبداللہ جان انتہائی وضع دار، بردبار اور بہادر انسان تھا۔ بہت خوب صورت شکل و صورت کا مالک، بہت خوش پوش، سادہ اور ملنسار شخص۔ اپنی طویل بیماری سے قبل جب وہ آنے جانے کے قابل تھا تو ہم نے ہمیشہ اسے استری شدہ لباس میں دیکھا۔ شیوا کیا ہوا، جوتے پالش شدہ، واسکٹ پہنا ہوا۔ پھر، شدید معذوری کے باوجود بھی وہ کبھی بھی ''اَن دھلا''، ''اَن سجا'' نہ رہا۔ بہت وجاہت اور کشش تھی اُس میں۔ درمیانہ قد، جسیم جسم اور چمکتی آنکھوں والا عبداللہ جان پہلی ہی ملاقات میں دل موہ لیتا تھا۔ وہ بہت مہذب طور طریقے رکھتا تھا۔ بلوچی میں ''آپ'' بہت کم استعمال ہوتا ہے مگر اس کا انداز تخاطب ''شما'' کے علاوہ کچھ رہا ہی نہیں۔ بہت جمہوری طرز رکھتا تھا۔

کمال خان شیرانی نے ایک بار مجھے بتایا کہ جمالدینی جوانی میں بہت خوب صورت اور جاذب نظر تھا۔ جب سائیں کمال خان نے اس کی جوانی کی وجاہت وحسن کے بارے میں بتایا تو فطری طور پر میں نے پروفیسر صاحب سے پوچھا تھا کہ:

''کیا آپ نے محبت کی؟''

بے چین ہوئے بغیر چیخ کر اس نے بلوچی میں کہا، ''ہاں''۔ ''محبت بہت ضروری ہے، یہ آپ کو روشن فکری عطا کرتی ہے، جرأت اور اطمینان دیتی ہے۔ محبت میرے ذائقے کی چیز ہے۔ یہ مجھے لٹریچر اور آرٹ کی طرف اکساتی رہی ہے''۔

محبت انسان دوستی بھی تو عطا کرتی ہے اور عبداللہ جان بہت ہی بشر دوست تھا۔

عبداللہ جان سیکھتا تھا تو جتا جتا کر، مگر سکھاتا تھا غیر محسوس طور پر۔ وہ ہر شخص سے سیکھتا

تھا۔ اس لیے کہ ہر شخص کا شعبہ حیات، طرزِ تربیت، ماحول اور حلقہ الگ الگ ہوتا ہے۔ جاہل سے جاہل شخص بھی دوسرے کو کچھ نہ کچھ دے سکتا ہے۔ بلوچستان سنڈے پارٹی کی محفلوں میں ماما عبداللہ جان بہت ہی اچھا سامع تھا۔ وہ آپ کی ہر بات یوں سنتا جاتا، جیسے وہ پہلی بار سن رہا ہو۔ اُس پر طرہ یہ کہ آپ کی گفتگو کو وہ اپنی محفلوں میں کوٹ بھی کرتا رہتا تھا۔

محفل نئے لوگوں کی ہوتی یا پرانے احباب کی، میر عبداللہ جان ایک خاص بھاری پن طاری کر دیتا۔ اُس کی موجودگی بے تکلف علمی مباحثے جنم دیتی تھی۔ ایک ایسا دائرہ کھچ جاتا جس کو پار کرنے سے آدمی جل جاتا (بچوں کا ایک بلوچی کھیل)۔

اسی طرح جب وہ کسی نو آمدہ شخص کا تعارف کرواتا تو اُس کی صفات بیان کرتا جاتا۔ بغیر مبالغہ کے، بغیر لفاظی کے ساتھ۔ بالخصوص خواتین کا تو بہت تکریم واحترام کے ساتھ تعارف کرایا کرتا تھا۔

ماما ایک اور خاصیت جیت چکا تھا۔ احباب اور عزیزوں کے بچوں کے نام وہ رکھتا تھا۔ جب بھی کسی کے گھر بچہ یا بچی پیدا ہوتی تو وہ ماما کو ایک فون کرتا تھا بس اُس کی ذمہ داری ختم۔ ماما دو تین دن لگا کر بہت محنت کے بعد ایک نام بتا دیتا تھا۔ میرے بیٹے شاہ ملوک کا نام اُسی نے رکھا تھا۔

ماما اکثر سوچتا ہی رہتا تھا۔ نئے نئے خیالات، نظریات..... بلوچی زبان کے بارے میں، بلوچ تاریخ کے بارے میں، دنیاوی سیاست کے بارے میں، انسانیت کے بارے میں۔ ہم اس سے جب بھی ملے کچھ نہ کچھ نیا پن لے کے ہی لوٹے۔

میر عبداللہ جان کو آخری عمر میں بھی مطالعے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس کے دوست اور اس کے بیٹے اُسے ہر وقت اچھی اچھی اور نئی نئی کتابیں لا کر دیتے ہیں۔ اس کا رجحان سائنسی کتب پڑھنے کی طرف بہت زیادہ ہے۔ آئزک آسی موف، کارل ساگان، سٹیفن ہاکنگ، اور ڈارون کی ساری کتابیں وہ آخری عمر میں پڑھ چکا تھا۔ وہ فلسفہ، تصوف اور تاریخ کے موضوعات پہ ہر وقت پڑھتا اور بولتا نظر آتا تھا۔ چوں کہ بہت عرصہ علیل رہا، اس لیے سارا وقت گھر میں رہتا تھا

اور ہر وقت پڑھتا رہتا تھا۔اس کی یادداشت بلا کی تھی۔ وہ اس بسیار خوانی کے باوجود ہر کتاب سے ٹھیک ٹھیک حوالے دیتا جاتا تھا۔اُسے جو کتاب پسند آتی تو احباب میں اس کا خوب چرچا کرتا اور اپنی نگرانی میں تمام دوستوں کو باری باری وہ کتاب مہیا کرتا۔

عبداللہ جان ترجمے کو بہت اہم گردانتا تھا۔ وہ بلوچی زبان کے سٹینڈرڈائزیشن اور رسم الخط کے ارتقا سے مطمئن تھا۔ ہمہ وقت بلوچ زبان اور بلوچ عوام کی ترقی اور بہبود کے بارے میں سوچتا اور بولتا تھا۔

''لٹ خانہ'' اُس کی سیاسی زندگی کی ابتدا تھی اور ''بلوچستان سنڈے پارٹی'' اُس کے سیاسی سفر کا آخری پڑاؤ تھا۔ان دونوں زمانی نکات کے درمیان میں اس نے بے شمار طریقوں سے اپنے فکر کی خدمت کرنے کی کوشش کی۔مگر وہ جہاں اور جس سیاسی لباس میں بھی رہا،سوشلزم کی سیاست کا گم نام سپاہی ہی رہا۔اُس کے سامراج دشمن اور فیوڈلزم مخالف نظریات کبھی نہ بدلے۔ایسا سیاسی سفر جو بدقسمتی سے اُس کے ادبی وعلمی کارناموں اور ذاتی اوصاف میں کہیں اوجھل رہا۔

بلوچستان اور اس پورے خطے میں قومی اور عوامی تحریک کی بنیاد ڈالنے،اُس کی تعمیر،اُس کی نظریاتی بھل صفائی اور اُس کی تنظیم کاری کی بھاگ دوڑ میں عبداللہ جان کا ،کمال کام تھا۔ وہ انسانوں کے دماغ اور فکر کو مغلظات سے پاک کرنے کا ہول ٹائمر تھا۔وہ قوموں کے درمیان نفرتوں کے تائید کنندگان کا سب سے ناپسندیدہ فرد تھا۔ وہ قوموں کے درمیان ''پرامن بقائے باہم'' کا سب سے بڑا ترجمان تھا۔زندگی کے دیگر شعبوں ہی کی طرح سیاست میں بھی تعصب،عبداللہ جان کا جانی دشمن رہا۔سیاست میں وہ جہالت اور جاہلانہ رویوں کا سب سے بڑا مخالف تھا۔وہ عوامی تحریک میں محنت کش طبقے اور خواتین کی شمولیت کو لازمی قرار دیتا تھا۔اس نے سیاسی اور سماجی دونوں لحاظ سے قبائلی جنگوں کی مخالفت کی اور ان خون آشام بردار کُش جنگوں کے تصفیے کی کوششوں کو ابھارنے اور بڑھاوا دینے میں ہمیشہ سرگرم رہا۔

عبداللہ جان جمالدینی البتہ سیاسی منظرنامے اور ملک میں موجود سیاسی پارٹیوں سے خوش نہیں تھا۔''ہر طرف بے ایمانی ہے،اقربا پروری ہے اور حرص ہے،فرقہ واریت روزمرہ کا معمول بن

چکی ہے''۔اس کے خیال میں ہر دانش ور کا فرض ہے کہ وہ رواداری، جمہوریت اور ترقی پسندی کی فضا قائم کرنے میں اپنا حصہ ادا کرے۔ وہ عوام کے اتحاد کو ہر مرض کا علاج سمجھتا تھا۔ وہ جمہوریت کو پاکستانی عوام کی تقدیر اور منزل قرار دیتا تھا۔ ماما سیاست میں مذہبی قوتوں کی مداخلت کو ناپسند کرتا تھا۔ وہ انہیں رجعت پسند اور ترقی دشمن قرار دیتا تھا۔اس کے خیال میں یہ ملّا ہی ہے، جس نے مسلمانوں کو پسماندگی کی راہ پر ڈال رکھا ہے۔ ماما سیکولرزم پہ یقین رکھتا تھا۔سیکولرزم سے اس کا مطلب تنگ نظری سے نجات تھا۔اس کے خیال تھا کہ ایک مبنی برانصاف معاشرہ ساری ملکی آبادی کو باعزت روٹی کپڑا اور رہائش مہیا کرسکتا ہے۔

عبداللہ جان خود کو ترقی پسندوں کا باوا آدم کبھی نہیں کہتا تھا۔ وہ مولانا روم کو بھی ترقی پسند کہتا تھا،اقبال،شیخ سعدی،حافظ شیرازی،فریدالدین عطار.....سب اس کی نظر میں،اور بالکل درست انداز میں،ترقی پسند تھے۔سب کے سب تو انسان کی بھلائی چاہتے تھے تاکہ انسان بھوک اور بیماری سے آزاد ہوں اور لوگ ایک دوسرے سے محبت کریں۔

میر عبداللہ جان انتہائی Optimist انسان تھا۔ وہ ایمان داری کے ساتھ سمجھتا تھا کہ ترقی بلوچستان کے عوام کا مقدر ہے۔ وہ انسانی ترقی سے کبھی مایوس نہیں ہوتا تھا۔اس کا ایقان تھا کہ انسان ہمیشہ ترقی کرتا جاتا ہے اور نظریہ اُسے روشنی دیتا رہتا ہے۔

وہ تعلیم کے حصول کے حق کا زبردست حامی تھا۔ وہ تعلیم کو سائنسی بنانا چاہتا تھا۔ وہ موجودہ نظام تعلیم کی پسماندگی پہ بہت کڑھتا تھا۔ وہ یکساں نصابِ تعلیم کا حامی تھا۔

میرے بڑے بھائی میر وخان نے ایک بار اس سے درخواست کی تھی کہ آپ اتنے اچھے آدمی ہیں،نماز بھی پڑھ لیں تو کتنا اچھا ہو۔ میں جب گاؤں جارہا تھا تو ماما نے میر وخان کے لیے پیغام بھیجا کہ،''آپ نے بہترین تجویز پیش کی تھی۔ میں اس پر عمل کرنے لگا ہوں۔ میں ساری ساری رات تہجد پڑھتا رہتا ہوں.....فکر کرتا رہتا ہوں''۔

اسے سائیں کمال خان شیرانی کا وہ تکیہ کلام بہت پسند تھا جو وہ ''کیا حال ہے؟'' کے جواب میں کہتا تھا:

''شُکر ونہ باسم'' (شکرادا کرتا رہتا ہوں)۔ میر صاحب سورۂ حمد کی آخری آیتوں کا ورد ہر ساتھی کے لیے اہم سمجھتا تھا۔"اھدنا الصرٰۃ المستقیم،صراۃ الذین انعمت علیھم،غیر المغضوب علیھم ولاالضالین"۔

وہ یوسف عزیز مگسی کو عظیم انسان قرار دیتا تھا۔''مگسی، سرداری نظام کے خلاف عظیم مجاہد تھے۔ وہ مارکسی نقطہ نظر تک پہنچ چکے تھے اور سماجی تبدیلی کے لیے لڑے''۔

عبداللہ جان جمالدینی نے سیاسی غلطیاں جی بھر کے کیں۔ مگر جونہی احساس ہوا فوراً پلٹا، اپنی غلطی کا برملا اعتراف کیا اور اپنی لائن سیدھی کر لی۔ مارکسزم آخر تک اس کا پسندیدہ اور منتخب فلسفہ رہا۔ اس کے اطلاق کے طریقوں پہ ایک آدھ دفعہ بہک جانے کے باوجود وہ اپنی پیرانہ سالی تک اس سے وفا کرتا چلا آیا۔ اپنی عملی زندگی میں بہت سارے دوست بنائے، بہت سارے شاگرد اپنائے اور بہت ساری سرگرمیاں کیں۔ مگر مارکسزم ان سب امور میں واحد اور مرکزی نصب العین کی حیثیت میں رہا۔ اس کی خاطر اس نے تکالیف کے دریا پار کیے۔ عزیز ترین دوستوں سے بچھڑا اور بہت سے دنیاوی مفادات تج دیے۔ وہ بزنجو کا ذکر ایک پرانے دوست کی حیثیت سے کرتا ہے مگر اس نے اس کے ''استمان گل'' میں شمولیت نہ کی اور اپنے فلسفہ اور نظریے کے مطابق ایک اور تنظیم قائم کی جس کا نام ''دیمارووک اولس'' (پروگریسو عوام) تھا۔ اسی طرح جب عبدالصمد خان اچکزئی نے کمال خان شیرانی اور خدائیداد خان کو اپنے ''ورور پشتون'' (پشتون بھائی) میں شامل ہونے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی، اور کمال خان اس کے ساتھ ہولیا۔ مگر جمالدینی اپنے ''دیمارووک اولس'' کے ساتھ ہی رہا۔ بہادر خان بنگلزئی اس کا صدر تھا اور ملک پناہ اس کا جنرل سیکرٹری، لالا غلام جان شاہوانی بھی ان کے ساتھ تھا۔ NAP قائم ہونے کے بعد، البتہ یہ تنظیم اس میں ضم کر دی گئی۔

ستر کی دہائی میں نیپ میں شامل ہو کر اس نے اپنی پوری سیاسی سلمیت تو سردار کے ہاں گروی رکھی البتہ نظریاتی حرمت سرداروں کے حوالے نہ کی بلکہ قلم کے ذریعے اپنی دستار بچاتا رہا۔ اسی عرصے میں اسے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ تب اس نے سرداروں کو عوام سے الگ طبقہ ظاہر کیا اور ان کے مفادات کو ایک دوسرے کی ضد ثابت کر دیا۔ جب خود ان پہ اصلیت مکمل طور پر آشکار

ہوئی تو کفارے کے بطور بی ایس او ''عوامی'' کی راہنمائی کرنے لگا۔ اس کا یہ وژن اور عرفان بعد میں ہر زمانے میں درست ثابت ہوا۔

عبداللہ جان زندگی بھر فرسودہ رسوم و روایات کے خلاف جدوجہد کرتا رہا۔ اس نے نہ صرف اپنی بچیوں کو تعلیم دلائی بلکہ دیگر خواتین کو بھی حصول علم کی ترغیب دی۔ وہ سمجھتا تھا کہ عورت کی تربیت اس طرح ہو کہ وہ اپنا اچھا برا خود سمجھ سکے اور اپنی حفاظت خود کر سکے۔ وہ عورت کی ملازمت کو بھی اہم سمجھتا تھا۔ عورت کی معاشی آزادی کو وہ بہت زیادہ اہم گردانتا تھا۔ اس کے خیال میں عورت اگر معاشی طور پر شوہر کی دستِ نگر نہ ہو تو اس کی سماجی آزادی اور برابری کی راہیں خود بخود صاف ہوتی رہیں گی۔ پروفیسر جمالدینی، بلوچ معاشرے میں عورتوں کی نجات کے لیے ایک مضبوط تحریک کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا تھا۔ اس کے خیال میں عورت مشقت کی ایک مشین بنا دی گئی ہے ۔میلوں دور سے پیٹھ پر پانی اور لکڑی لاد کر لاتی ہے۔ غلام سے بھی بدتر حیثیت رکھتی ہے وہ۔

ایک بار جب میں نے اس سے پوچھا کہ اگر اس کے پاس لکھنے والوں کی ایک ٹیم ہو تو وہ کیا کام کروانا چاہے گا؟ اس کا کہنا تھا کہ وہ بلوچستان کی تاریخ کو تاریخی مادیت کی بنیاد پر ترتیب دینا چاہتا ہے۔ وہ اُس ٹیم سے قدیم بلوچی شاعری جمع کرنے، بلوچی کی ایک جامع ڈکشنری بنانے، بلوچستان کی سیاسی تاریخ لکھنے اور آخر میں ''بلوچ سماج میں عورت کا مقام'' پر لکھنے کو کہے گا۔ اور جب یہ آخر الذکر کتاب میں نے ہی لکھ ڈالی تو اس کی مسرت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

میر عبداللہ جان بہت حساس دل و دماغ کا مالک تھا۔ وہ انسانی مسرتوں پر جی بھر کے خوش ہوتا تھا۔ بزرگ سنی کے باوجود جشنِ نوروز پہ خوب چہچہاتا تھا، عید اور کرسمس میں خوشی مناتا تھا۔ ویلنٹائن ڈے تک کے مطالب و معنی کی گہرائی سے واقف تھا۔ مگر وہ انسانی مصائب پہ دکھی بھی اُسی شدت سے ہو جاتا۔ جنگ، فساد، وبا اور زلزلوں کے نتیجے میں انسانی جانوں کا ضیاع، زخمیوں کی آہ و بکا عبداللہ جان کو ہلا کر رکھ دیتے تھے۔ ایک بار اس کی بچی نے فون کیا کہ ''جلدی آؤ تمہارا ماما صبح سے رو رہا ہے''۔ میں جب وہاں پہنچا تو دیکھا وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ پوچھا تو کہنے لگا: ''روانڈا میں انسان مر رہے ہیں اور ہم ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہے''۔

عبداللہ جان اس خطے میں بہت بڑا انسان تھا۔

عبداللہ جان کئی بار بلوچی اکیڈمی کا چیئرمین بنا، اکیڈمی ادبیات کے بورڈ آف گورنز کا ممبر رہا، اور پھر وہ ماہنامہ 'سنگت' کا چیف ایڈیٹر رہا۔ سرکاری تمغوں کا ذکر دنیاوی اور حقیر بات ہے۔ مگر یہ بتانا ضروری ہے کہ اسے 1990 میں صدارتی ایوارڈ، نیشنل بک کونسل اسلام آباد کا بہترین ادیب کا ایوارڈ 1991 میں ، اور باچا خان ایوارڈ 1992 میں ملا۔ اس نے ملکی و بین الاقوامی اجتماعات میں بے شمار مقالات پڑھے۔ اس نے بے شمار یونیورسٹیوں میں لیکچر دیے۔ جن میں انگلینڈ، سویڈن، ناروے، اٹلی اور ایران شامل ہیں۔ وہ جب لندن گیا تو کارل مارکس کی قبر پر سلامی کے لیے بھی گیا۔ جہاں اس سے قبل ایک ویت نامی وفد پھولوں کے ہار چڑھا کر رخصت ہو رہا تھا۔ اُن کے فوراً بعد عبداللہ جان اسے نذرانۂ عقیدت پیش کرنے گیا۔ اس باغ جیسے قبرستان میں چھوٹے انگریز بچے کھیل رہے تھے۔ جب انہوں نے اتنے سارے لوگوں کو مارکس کی قبر کی زیارت کرتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی قریب آئے اور قبر کے سرہانے مارکس کے مجسمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معصومیت سے کہنے لگے:

"It means that uncle was a very good man"

Good man مارکس کا یہ Good man پیروکار، بہت بڑا آدمی تھا۔ مجھے یاد ہے جب سندھی زبان کے بہت بڑے لکھاری جناب سوبھو گیان چندانی کو اکیڈمی آف لیٹرز کی جانب سے ملک کا سب سے بڑا ادبی و علمی اعزاز ''کمالِ فن ایوارڈ'' ملا تو عبداللہ جان ملک بھر میں وہ سب سے پہلا شخص تھا، جس نے خوشی کا اظہار کیا:

> ''انتہائی خوشی کی بات ہے کہ زندگی کے آخری دنوں میں جب کہ وہ بیماریوں کی اذیتوں سے نڈھال ہیں، پاکستان کے سب سے بڑے ادبی ادارہ ادبیات پاکستان نے ان کی زندگی کی جدوجہد کا صحیح اندازہ لگا کر انہیں اپنے اس سب سے بڑے اعزاز سے نوازا ہے۔ یہ فیصلہ نہ صرف سوبھو گیان چندانی کی زندگی کی جدوجہد کی پذیرائی ہے بلکہ خود

> پاکستان کے اس ادبی اور مایہ ناز ادارے کے لیے باعثِ افتخار اور عزت ہے۔ میں اس پینل کو جس نے یہ فیصلہ کیا ہے احتراماً سلام پیش کرتا ہوں۔ اور پینل کے صدر نشین محترم جناب ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں''۔

میر عبداللہ جان کی دلچسپ عادتیں تھیں۔ وہ ہر قریبی دوست کو (اسے ہر دوست کا فون نمبر زبانی یاد ہوتا) فون کرتا۔ اُس طویل بیماری میں بجائے اس کے کہ لوگ اس کی طبیعت کا پوچھیں، الٹا وہ اُن کی خیریت دریافت کرتا۔ مجھے بھی وہ ہر شام بلا ناغہ چھ بجے آدھ گھنٹہ پر مشتمل فون کال ضرور کرتا۔ فیملی کے ہر ممبر کا نام لے لے کر پوچھتا۔ پھر پاکستان بھر کے دوستوں اور ان کے بچوں کا حال پوچھتا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں کیا ادبی سیاسی سرگرمیاں رہی ہیں، کون ملنے آیا، کس سے فون پر باتیں ہوئیں، کیا خطوط آئے، کیا کتاب چھپی۔ ہر تفصیل پوچھتا بھی تھا اور بتاتا بھی تھا۔ اس کی زندگی کے آخری برسوں میں ایک بار جب کیوبا کا فلسفی صدر فیڈل کاسٹرو بیمار ہو کر ہسپتال داخل ہو گیا تو میں نے ماہنامہ ''سنگت'' میں اس کی بیماری کی اطلاع اور اس کی صحت مندی کی تمنا پر مشتمل ادارتی نوٹ لکھا۔ بس پھر کیا تھا؟۔ ماما ہر شام بلا ناغہ فون پر اس کی صحت کے بارے میں پوچھتا اور میں انٹرنیٹ سے حاصل کردہ تازہ ترین بلیٹن اسے سناتا۔ کہاں کیوبا، کہاں بلوچستان! کاسٹرو کو پتہ بھی نہ ہوگا کہ اُس کے نامعلوم دعا گو کہاں کہاں موجود ہیں۔

کبھی کبھی تو دلچسپ باتیں ہو جاتیں۔ ایک شام کہنے لگا:

''میں رات کو سوچ رہا تھا کہ خدائیداد اور امیر الدین کے بعد اب تمہیں کون چھوڑ دے گا۔ پہلے میں ساتھ چھوڑ دوں گا یا سی آر اسلم؟''

میں: ''اور اگر خود میں پہلے مر جاؤں تو؟''

ماما: ''نہیں نہیں۔ خدا نہ کرے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''۔

میں: ''کیوں؟۔ ضروری تو نہیں کہ گندم پک جائے تو اسی وقت کاٹی جائے، سبز گندم بھی تو کٹتی ہے''۔

ماما: ''بری باتیں نہ کرو۔ہم دونوں کی بقیہ عمریں تمہیں لگ جائیں''۔

میں: ''اچھا؟۔ماما یہ آپ والی عمر تو ٹھیک ہے، آپ اُس کے مالک ہیں مگر سی آر کی عمر کا اختیار آپ کو کس نے دیا؟''

ماما: ''ارے ہاں، میں نے غیر جمہوری بات کہہ دی''۔

ہم دعائیں کرتے رہے کہ اپنی عام گپ شپ میں بھی ''جمہوری غیر جمہوری'' کا خیال رکھنے والے اس بڑے انسان کا سایہ دیر تک بلوچستان پہ رہے۔ایسی سراپا محبت بھری شخصیت کا دم غنیمت تھا کہ ایسی خاصیتیں ناپید ہوتی جارہی ہیں۔

.....اور وہ دیکھئے، پہلے سی آر اسلم بچھڑ گیا!!

جب وہ فون کر کے احباب کا پوچھتا تھا تو جس دوست کی خبر نہیں دیتا تو وہ مزید کریدتا۔ ایک بار میں نے اسے بتا ہی دیا کہ دل کا فر ہے، جس شخص میں کوئی خودغرضی وغیرہ دیکھتا ہوں تو پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔ماما نے آدھ گھنٹے کا ٹیلی فونک خطاب والا لیکچر پلا دیا کہ ''دل پہ قابو رکھو'' دوستوں کی کم زوریاں درگزر کرو، انہیں وفا کے ذریعے، رابطے کے ذریعے دوستی کے ذریعے درست کرنے کی کوشش کرو''..... ماما گریٹ تھا!!

جس شخص سے میں نے عبداللہ جان کا تذکرہ سنا تو میں نے اُس سے محض ایک سوال کیا، ''کیا آپ کے اپنے ساتھ اس نے کوئی نیکی کی؟''۔ مجھے عبداللہ جان کا تذکرہ کرنے والے ان ہزاروں آدمیوں میں ایک بھی انسان ایسا نہ ملا جس نے ''ذاتی احسان'' کا تذکرہ نہ کیا ہو۔اور اُن میں سے نوے فیصد لوگ بتاتے تھے کہ زندگی میں (بالخصوص تعلیم میں) آگے بڑھنے کی حوصلہ افزائی عبداللہ جان نے کی۔کسی کو ایم فل پی ایچ ڈی پر اکسایا، کسی کو مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کی ترغیب دی، کسی کو مطالعے کی عادت ڈالی، کسی کو زندگی کا پیشہ متعین کرنے میں صلاح کاری دی.....

ذاتی زندگی میں مثبت اثر ڈالنے والی شخصیتوں کا تقابل کیا جائے تو عبداللہ جان نمبر ایک پر ہوگا۔

عبداللہ جان کو دکھاوا بہت برا لگتا تھا، اور علمیت کا دکھاوا تو زہر لگتا تھا۔جو بھی دوست اپنا علم، بانٹنے کے بجائے رعب و دکھاوے کے لیے استعمال کرتا، عبداللہ جان بہت جلد اُس سے دور ہو

جاتا۔اور بڑے ہی غیر محسوس طریقے سے دُھرا دُھرا کر کہتا:

آنکس کہ نہ داند و بداند کہ بداند
در جہلِ مرکب ابدا لدھر بماند
آنکس کہ نہ داند و بداند کہ نہ داند
او نیز خرِلنگ بہ منزل بہ رساند
آنکس کہ بداند و بداند کہ نداند
اسپِ طربِ خویش بہ افلاک رساند

عبداللہ جان جمالدینی نے پہلے ماہنامہ ''نوکیں دور'' اور بعد میں ''سنگت'' کی اشاعت، اور باقاعدگی سے اشاعت پہ بہت حوصلہ افزائی کی۔وہ ''سنگت'' کا نہ صرف ایڈیٹر، پھر چیف ایڈیٹر، اور پھر سرپرست اعلیٰ تھا بلکہ جنون کی حد تک اس کا معاون و مددگار بھی تھا۔اس کے تمام ادبی شہ پارے ''سنگت'' میں شائع ہوتے رہے۔وہ ہمارے نظریاتی مخالفوں کے حملوں میں ہمیں ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتا تھا۔چوں کہ یہ نظریاتی مخالفین کئی بار بہت ہی ہلکی زبان تک استعمال کر جاتے اور احباب کا ردعمل شدید ہو جانے کے امکانات پیدا ہوتے تو ماما ہمیشہ ایک لمبی تقریر فرماتا اور قائل، درخواست، خواہش اور حکم کا ملا جلا معجون تیار کر کے ہمیں کھلا دیتا۔ان سارے معجونوں میں وہ یہ شعر ضرور شامل کرتے ہیں:

عرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدارا

ہم نے ظاہر ہے اس کی بات ماننی ہوتی کہ یہی عقلِ سلیم کا تقاضا ہوتا تھا۔دلچسپ بات یہ تھی کہ ''سنگت'' کے مخالفین موقع پرست لوگ ہی ہوتے۔قوم پرستی کی آڑ میں سردار پرستی کرتے کرتے، سرکار پرستی اور سامراج پرستی تک چلے جاتے۔جو لوگ سرکار کے لیے حقیر ترین خدمات سرانجام دے رہے ہوتے ہیں، وہ ایسی انتہا پسند سرکار مخالف تحریر لکھتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ایجنٹ پروووکیٹر کی حد تک تیز تحریریں۔اسی طرح ہمارے جو مخالفین سرکار کی پرستش کرتے ہیں۔وہ

اپنی دلیلوں میں کہیں نہ کہیں ''سنگت'' سے کراہت ونفرت کا عندیہ ضرور دیتے ہیں۔کبھی نام لے کر اور کبھی ''اُن'' اور ''وہ'' کہہ کر۔اور ایسا کہنے میں ان کا لہجہ، دلائل اور گرائمر کبھی بھی شائستہ نہیں ہوتا۔ ماما ہمیں ''اپنا کام کیے جاؤ'' پر قانع کرنے میں کامیاب ہوتا تھا۔ہم گزشتہ تیس برس سے ایک انتہا پسند معاشرے کے اندر عقل سلیم صرف اور صرف اس لیے سرانجام دیتے رہے ہیں کہ ہمیں عبداللہ جان جیسا امرت دھارا میسر تھا۔

وہ ''سنگت'' رسالہ کو ہر طرح کے سیاسی کام کے مقابلے میں ارفع کام قرار دیتا تھا۔سخت باتیں کرنے سے منع کرتا۔وہ نعرے بازی سے سخت نفرت کرتا تھا۔نئے نئے لکھاریوں کی شمولیت کو بہت پسندیدگی سے دیکھتا تھا اور باقاعدہ فون کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔وہ نئی نسل کو بہت ذہین، اور لائق سمجھتا تھا۔اسے نوجوانوں سے بہت توقعات تھیں۔وہ ان سے بہت پرامید تھا۔وہ ان کے ہر اچھے کام کی بھرپور داد دیتا تھا۔ماما کی یہ عادت قابلِ رشک اور قابلِ تقلید ہے۔ اگر بلوچستان، ہر اچھے کام پہ ''شاباش'' دینے کی اس کی پیروی کرے تو اُسے کسی دشمن سے خوف زدہ ہونے کی کبھی بھی حاجت نہ رہے۔ماما بلاشبہ ان چند لوگوں میں سے تھا جو 'سنگت' کو سرورق سے لے کر بیک ٹائٹل تک پڑھتے تھے۔

ایک بار اس کا فون آیا تو باتوں باتوں میں میں نے پوچھا، آج کل کیا پڑھ رہے ہیں تو اس نے بڑے عجیب انداز میں جواب دیا: ''آپ کو تو دنیاوی کاموں سے فرصت نہیں۔ایک پرچہ ہے سنگت نام کا، کوئٹہ سے نکلتا ہے، وہ پڑھ رہا ہوں''۔

> اس کے اپنے بقول: ''میری عادت ہے کہ سنگت میں اشتہارات کے سوا کوئی بھی تحریر میری نظروں سے نہیں چھوٹتی۔اور بہت اشتیاق اور انتظار کے بعد جب بھی مجھے سنگت کا پرچہ ملتا ہے تو میں سب کچھ چاہے کتنی ہی دلچسپ اور خوب صورت کتاب اور تحریر ہو، اُسے چھوڑ کر سنگت پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔جب تک اس شمارے کو ختم نہیں کرتا کچھ اور نہیں پڑھتا.....سنگت کی پالیسی مجھے بے حد پسند ہے''۔(1)

وہ پڑھنے کے بعد کئی ہفتوں بعد بھی رسالے کا ایک ایک عنوان گنوا دیتا، اس کے مضامین میں قابلِ ذکر ایک ایک لفظ یاد رکھتا تھا اور بعد میں بڑی تفصیل سے تعریف یا تنقید کرتا تھا۔حوصلہ افزائی کے انداز میں، تعمیر کے جذبے کے ساتھ۔

عبداللہ جان ملکی و بین الاقوامی سیمناروں، کانفرنسوں میں بلوچستان کی نمائندگی کو بہت اہم قرار دیتا تھا۔وہ اپنی پیرانہ سالی اور بیماری کے باوجود ٹیلی فون کر کر کے، پیغام بھجوا بجھوا کر لوگوں کو ان میں شرکت کے لیے تیار کرتا۔انھیں گائیڈ کرتا اور واپسی پر ان کی پوری سرگزشت بہت مزے سے سنتا۔ماما کی یادداشت بلا کی تھی۔جس سے ملتا تو اس کے والدین کا نام لے کر اُن کی خیریت معلوم کرتا۔

میر عبداللہ جان لوگوں کو، بالخصوص بلوچ نوجوانوں کو شعور دینے کے عمل کو دیگر سارے سیاسی سماجی کاموں سے زیادہ متبرک سمجھتا تھا۔اس لیے وہ ہمارے میگزین کی اشاعت کو حد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔اس کے اپنے آبائی ضلع چاغی میں 'سنگت' بہت پڑھا جاتا ہے۔مگر ایک بار اچانک قوم پرستی کے تیز طرار نعرے بازی میں جب وہاں 'سنگت' کی خریداری اچانک کم پڑ گئی تو اسے بہت صدمہ ہوا۔اس نے اپنے ضلع کو ''کوفہ'' کہنا شروع کر دیا۔اسے بہت تکلیف پہنچی تھی۔

عبداللہ جان کھلکھلا کر ہنسنے والا انسان تھا۔مزاح کو بہت زیادہ پسند کرتا تھا۔لطیفے، چٹکلے اور قہقہے اس کی محفل کی بنیاد ہوتے تھے۔وہ اپنی زندگی کے پرمزاح واقعات بہت جھوم جھوم کر سناتا۔ اور جب ہنسی کا دورہ پڑ جاتا تو بہت دیر تک اس کیفیت میں رہتا۔موقع ڈھونڈتا تھا کہ کہیں سے کوئی خوش گوار جملہ آئے۔وہ اپنی محفل میں یوں تو ہر دوست کو یاد کرتا تھا مگر گپ شپ والے احباب کی غیر حاضری کو تو گویا برداشت ہی نہیں کرتا۔

لیکن ماما طنز کو، طعنہ کو بہت ناپسند کرتا تھا۔وہ کسی ایسی بحث کا حصہ نہیں بنتا جس میں کسی انسان کی توہین کا پہلو نکلتا۔ایسے تمام لطیفوں، حکایتوں، استعاروں اور محاوروں کا سختی سے محاسبہ کرتا جو کسی نسل کسی قوم کے خلاف ہوتے۔اسی طرح اس کی نفرت غیبت کے خلاف بھی تھی۔وہ افراد کے بارے میں اور بالخصوص غیر حاضر لوگوں کے بارے میں منفی بات بالکل نہیں سن سکتا تھا۔گھما پھرا کر

موضوع کسی اور طرف لے جاتا۔ ماما اپنی غلطیاں مزے لے لے کر سناتا مگر دوستوں کی اچھائیاں ہی تلاش کر کر کے بیان کرتا جاتا۔

عبداللہ جان ٹی وی پروگراموں میں ڈسکوری، نیشنل جیوگرافی جیسے چینل بہت دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ اسے کائنات اور سماج کے ارتقا والے پروگرام بہت اچھے لگتے تھے۔ دوسرے نمبر پر وہ مزاحیہ پروگراموں کو ترجیح دیتا تھا۔ خبریں چوں کہ منافقتوں، سازشوں، بورژوا سیاست دانوں کی دروغ گوئیوں، کشت وخون اور اموات وتباہی سے بھری ہوتیں، اس لیے خبرنامہ شوق سے نہیں دیکھتا تھا۔ اخباروں میں بھی ادبی علمی اور فن وثقافت کے صفحے ہی غور اور دلچسپی سے پڑھتا تھا۔

بلوچستان اور قحط الرجال بہت زمانے کے ساتھی رہے۔ دشوار اور بھیانک طرزِ زندگی انتہا پسند رجحانات کو جنم دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ خانہ بدوش معاشرے میں موت زندگی کے پیچھے شکاری کتے کی طرح بھاگتی ہے۔ پانی کی کم یابی، خشک مزاجی کو جنم دیتی ہے۔ اٹھی ہوئی تلوار پُشتوں تک نیام میں نہیں جاتی۔ قبائلی ذہن سازش کے علاوہ کچھ سوچ نہیں سکتا۔ خیرخواہی بزدلی تصور ہوتی ہے، علم حلم اور بردباری نیچ رجحانات تصور کیے جاتے ہیں۔ قبائلی شاؤنزم ایک امتیاز کی صورت جلوہ گر ہوتی ہے۔

ایسے میں ایک ایسا شخص موجود ہوا جو اگر مری قبیلے میں بس جاتا تو مری کی خوش بختی ہوتی۔ مینگل میں ضم ہوجاتا تو مینگلوں کا اعزاز ہوتا۔ پنجابی ہوجاتا تو پنجاب کے پگ کا شملہ اونچا ہوتا، پشتون ہوجاتا تو ان کی اونچی شخصیات میں اضافہ ہوجاتا.....

اور میر عبداللہ جان یہ سب کچھ تھا۔ اس لیے کہ وہ ایک مکمل انسان تھا، انسان دوست تھا۔ میر عبداللہ جان جمالدینی مایوسی کے گھپ اندھیروں میں امید کی مشعل تھا۔ تعصّبات وذہنی تحفظات سے پاک، ہر شخص کا ذاتی دوست تھا۔ غیر جذباتی انداز میں باتوں کی چھان پھٹک کرتا تھا۔ بچوں، بڑوں کا شفیق ساتھی تھا۔ ماما کی تخلیقات کا محور سماجی انصاف جمہوریت، مظلوموں کی فکری رہنمائی اور اچھے اخلاقیات کی ترقی رہا تھا۔ ماما کا ذہن بہت ہی زرخیز تھا۔ اس میں مذہب قوم، زبان، رنگ اور نسل کا امتیاز نہ تھا۔ وہ انسانوں سے محبت کرتا تھا اور غریب طبقہ کا مددگار تھا۔ جمالدینی

صاحب عورتوں کے حقوق کا طرف دار تھا۔ ادیبوں کی صف کا ممتاز ممبر تھا۔ وہ کئی زبانیں جانتا تھا۔ ہر زبان سے محبت کرتا تھا۔ کلاسیکل ادب پہ عاشق تھا۔ بلوچی زبان کا استاد تھا۔ ہم خوش قسمت تھے کہ اس کی سنڈے پارٹی کے ساتھی رہے۔

خلیل جبران اپنے مضمون ''مرشد کا فرمان'' میں ایک عالم کی طرف سے لوگوں سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں: ''اے لوگو! میرے دل کا درخت میووں سے بھاری ہوچکا ہے۔ میں تم سب کو دعوت دیتا ہوں آؤ اور اس دعوت سے فائدہ اٹھاؤ اور میرے دل کا بوجھ ہلکا کردو۔ میری روح چاندی اور سونے کے خزانوں کے بوجھ سے تھک گئی ہے۔ چھپے ہوئے خزانوں کی تلاش میں سرگرداں رہنے والو! اپنی جیبیں بھرلو تاکہ میرا بوجھ ہلکا ہوجائے۔ میرا دل برسوں پرانی شراب سے بھرا ہوا ہے۔ اے پینے کا شوق رکھنے والو۔ آؤ تمہیں عام دعوت ہے۔ اپنی پیاس بجھالو''۔

اور حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ جان کی ذات ان واعظان بے عمل اور اُن اساتذہ کے لیے ایک چیلنج تھی جو اپنے علم پہ متکبر ہیں اور علم سے لوگوں کو محروم رکھتے ہیں۔ اس دریا کی طرح جو بہت تیزی سے بہتا ہے اور جس سے نہ کوئی زمین سیراب ہوتی ہے اور نہ کوئی اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔ ان کی سنڈے پارٹی والی محفل میں بیٹھتے تو حافظؔ، سعدیؔ اور رومیؔ دوبارہ زندہ نظر آجاتے۔ اس لیے کہ عبداللہ جان انہی کے دائرے میں انہی کی باتیں اور انہی کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ عبداللہ جان وہ معلم تھا جس نے تاریخ کے مطالعہ سے ماضی کی عظمتوں کا وجدان حاصل کیا۔ وہ لوگوں کو سربلندی اور نیکی کی تعلیم دیتا تھا۔ اس کی سانس حیات بخش ہوتی تھی اور ان کا وجود بنی نوعِ انسان کے زخمی دلوں کے لیے مرہم سے کم نہیں تھا۔ علم سے محبت اس کی شخصیت کی بنیاد تھی۔ آخر تک ان کی شخصیت زندگی کے ہر شکست خوردہ کے لیے توانائی اور امید کی ایک مثال رہی۔

جب سوویت یونین مستی اور اپنی ہی فریبی کے سبب ٹوٹ گیا تو بہت سے احباب کی سیاست کے اونٹ کا گویا مہار ٹوٹ گیا۔ وفاداریاں تبدیل ہوگئیں، پارٹیوں کے نعرے اور منشور سبز رنگ کے ہوتے گئے اور خاک نشینوں کے کئی طرف داروں نے محل مکینوں کو سجدہ کرنا شروع کیا۔ مگر عبداللہ جان کی سیاست کے سابقہ لاحقہ میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ ماما وہیں کھڑا رہا جہاں پچھلی صدی

کے وسط میں نائب تحصیل داری جیسی اُس وقت کی بہت بڑی نوکری کو ٹھوکر مار کر کھڑا ہو گیا تھا۔

موجود کو مسترد کرنے والا یہ شخص کبھی بھی ''گزارش کرنے والا'' سیاسی ورکر نہ رہا۔ ماما فیوڈل سیاست دانوں اور طاقت وروں کی آسودگی، عافیت اور کامیابی و کامرانی کے سارے طریقوں حربوں اور معیارات سے انحراف کرنے والوں میں سے تھا۔ اور اُس انحراف کی قیمت ادا کرنے والوں میں سے تھا۔

ماما شدید ترین حالات میں بھی سوچتا تھا کہ زندگی جینے کے قابل ہے۔

عوام کا یہ طرف دار انقلابی طبقاتی سماج کا خاتمہ چاہتا تھا۔ وہ عوام الناس کی بے چینیاں بڑھاتا تو نہ تھا، مگر انسانوں کی بڑھتی بے چینیوں کو ترتیب ضرور دیتا تھا۔ وہ بے نان ولباس آدم زادوں کو مایوسیوں میں بھٹکنے نہ دیتا تھا، وہ انہیں انسانیت کے روشن مستقبل کی متبادل راہ دکھاتا تھا۔

ہر وقت ایک متبادل سیاسی پارٹی کے قیام کی اُس کی کوششیں نعرے بازی سے پاک تھیں۔ وہ اپنے سیاسی شاگردوں کو (جو کہ تعداد میں بے شمار ہیں) ہمہ وقت ردِعملی سیاست سے دور رہنے کی تلقین کرتا تھا۔ وہ سیاسی کام ڈنڈے اور دھمکی سے نہیں بلکہ قائل کرنے، اور دل و ذہن پر قبضہ کرنے سے کرتا تھا۔ وہ صحافت، پبلشنگ، اکٹھ اور اجتماع کے توسط سے اپنی سیاست آگے بڑھاتا رہا۔ وہ لفظ چیدغ سے لے کر پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن تک، اور وہاں سے لے کر سنگت اکیڈمی تک اِسی دھیمے پن کے ساتھ ایک پوری نسل کی سیاسی تربیت کرتا رہا۔

یوں، نوے کی دہائی میں وہ بالآخر سیاسی ذہن رکھنے والے دانش وروں کا ایک ٹھوس گروپ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن ایک اہم بات کہنی تو ابھی باقی ہے: عبداللہ جان بیس برس تک فالج میں پڑا رہا۔ آپ حیران ہوں گے کہ بستر گیری کے ان بیس برسوں میں ایک دن بھی اس کا منہ اَن دُھلا نہ رہا۔ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان فالجی بیس برسوں میں ایک بار بھی اس کے کپڑے بے استری نہ رہے۔ وہ اس طویل عرصے میں ایک لمحہ بھی unattended نہ رہا، اور اس ربع صدی کی معذوری میں وہ ایک اتوار بھی دو درجن سے زائد سکالروں کی محفل سے محروم نہ رہا۔

وہ ہر سنڈے میں بپا ہونے والی اِن محفلوں میں بلوچستان کے سیاسی ورکروں، ادیبوں اور شاعروں کے ذہنوں کو مارکس کے افکار سے روشن کرتا۔ خود بولتا، دوسروں سے بلواتا۔ ایک بحث جنم دیتا اور محفل کو بھرپور نتائج اخذ کروا کر بامقصد بنواتا۔ اس کا فکر و عمل ناقابلِ فراموش ہے اور اتوار محفلیں ہماری دھرتی کی علمی اور عملی تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ وہ حاضرین کا شکر گزار رہا کہ اس کے بقول ''اُس کی زندگی کو طوالت بخشنے کی وجہ'' یہ اتوار پارٹی تھی۔ ہم بھی اُس کے شکر گزار کہ اس نے زندگی بھر علم اور سائنس کی روشنائی پھیلائی اور عوامی بہبود کا پرچم بلند رکھا۔

اُس کی یہ سنڈے پارٹی اب چھبیسویں برس میں داخل ہو چکی ہے۔

دو نکات پہ یہ پارٹی چل رہی ہے۔

ایک: موجودہ سیاسی بساط جاگیرداروں کی بچھائی ہوئی ہے جس میں عوامی شرکت نہ ہونے کے برابر ہے، اس کے متبادل کی تلاش۔ دو: ایسا متبادل جو فرقہ و نسل کے امتیاز سے بلند ہو۔

اسی طرح اُس نے سنگت اکیڈمی آف سائنسز بھی نوے کی دہائی میں بنتے دیکھی جو لوز چیدغ اور پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کا نیا جنم تھی۔ وہ 2016 کے آخر تک اس اکیڈمی کا روحانی سربراہ رہا۔

حوالہ

1۔ جمالدینی، عبداللہ جان۔ شمع فروزاں۔ سنگت اکیڈمی کوئٹہ۔ 2006۔ صفحہ 75

سنگت بیلیوں نے کہا تھا!

تندرستی بھری طویل عمری نے ماما کو ہم عصروں کا ایک پورا لشکر عطا کر دیا۔ ان میں اگر ظہور شاہ ہاشمی، آزاد جمالدینی، مولانا خیر محمد ندوی، سردار خان گشکوری، بشیر بلوچ، ڈاکٹر خدائیداد، کمال خان شیرانی، حاجی عبدالقیوم اور اکبر بارکزئی جیسے سینئر لوگ شامل ہیں تو ذرا سے ''نوجوان بزرگ'' ادیبوں کا بھی ایک لشکر موجود ہے۔ جمالدینی صاحب کے ترقی پسند خیالات نے بلوچی ادب پر دیرپا اثرات پیدا کر دیے اور خود بلوچ معاشرہ بہت متاثر ہوا ہے۔ سرداری نظام اور جرگہ کے خلاف ادیبوں شاعروں نے بہت کچھ لکھا۔ جہالت کے خلاف، بیماری پسماندگی کے خلاف بہت لکھا۔

عبداللہ جان اپنے ہم عصروں کے ساتھ باقاعدہ رابطے میں رہتا ہے۔ اور یہ ہم عصر محض وسعت بھرے بلوچستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں موجود ہیں۔

تاریخ اور بالخصوص سوشلزم کی تاریخ بتاتی ہے کہ انسانیت نے آج تک شخصیت پرستی سے زیادہ تباہ کن چیز نہیں دیکھی۔ فرد بہت اہم ہے مگر مافوق الفطرت نہیں ہے۔ ویسے بھی ابھی دس برس قبل تک ہم سب سیاسی ورکروں کو اپنی ذات کو پروجیکٹ نہ کرنے کی باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی۔ ذاتی تعریف انا پرستی کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ ''درمیانہ طبقے کی خباثت'' کہلاتی تھی۔

بالخصوص کمیونسٹ لوگ ذات کے حصار میں گرفتار ہونے کے سخت خلاف ہوا کرتے ہیں۔ بلوچ سیاست تو ہوتی ہی کھدر اور کانگریسی ٹوپی والی تھی۔ منکسر المزاجی قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کے زمانے سے بلوچ سیاسی ورکروں کی میراث چلی آ رہی ہے۔ اس لیے جتنے بھی بوڑھے سیاسی ورکر ہیں، وہ خود ستائش سے بہت دور بھاگتے ہیں۔ خود عبداللہ جان بھی اپنی توصیف کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار اس کی شخصیت اور فن پہ ایک شام منائی گئی، اور جب آخر میں اسے سٹیج پر بلایا گیا تو اس نے اپنے بارے میں یوں کہا:

> ''ایک بار ایک دیہاتی اپنا بیل فروخت کرنے شہر لے گیا۔ منڈی میں ایک ایجنٹ نے اپنی فیس لے کر اس کے بیل کی تعریفیں کرنی شروع کر دیں۔ وہ تعریفیں اتنی زیادہ اور اس قدر مؤثر تھیں کہ بیل کا مالک دیہاتی خود اپنے بیل سے متاثر ہوا۔ اور کہا، '' مجھے معلوم نہ تھا کہ میرا بیل اتنا اچھا ہے۔ اب جب مجھے معلوم ہو ہی گیا کہ یہ اتنا اچھا ہے تو میں اسے فروخت نہ کروں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے بیل کی مہار پکڑی اور واپس اپنے گاؤں روانہ ہوا۔
>
> میں بھی اتنا اچھا نہیں جتنا آپ مقرر خواتین وحضرات بول رہے ہیں''۔

شاید اسی نشست میں اس کے ہم عصر براہوئی زبان کے مصنف ومترجم پروفیسر گل بنگلزئی نے سب سے مختصر تقریر کی تھی۔ وہ جذبات سے اس قدر مغلوب ہوا کہ ایک فقرہ ہی ادا کر سکا، اور فقرہ کس قدر بیش بہا تھا:

> ''عبداللہ جان، بس..... میرا بھائی ہے''۔

اگر عبداللہ جان پیر نہیں ہے تو اس کے ساتھی کہاں سے سجادہ نشین ہوں گے۔ سب کے سب پروقار انکساری کے مجسم نمونے ہیں۔

کچھ کی رائے یوں ہے:

سی آر اسلم

''اچھا کیا آپ نے کمیونسٹ مینی فیسٹو کا بلوچی ترجمہ عبداللہ جان جمالدینی کو بھیج دیا۔ وہ باشعور اور صاحبِ ذوق انسان ہیں۔ مجھے صرف ان سے یہ گلہ ہے کہ وہ بی ایس او کے چکر میں مبتلا ہیں۔ اردگرد ہونے والے واقعات اس چکر سے نکلنے کا تقاضا کر رہے ہیں۔ کبھی ان سے ملاقات ہوئی تو اپنے دل کی باتیں اُن کے گوش گزار کروں گا''۔(7-6-82 کو میرے نام خط میں)۔

جناب عبداللہ جان جمالدینی صاحب کی شخصیت، ان کا فکر اور ان کا عمل بے حد قابلِ تعریف ہے۔ انھوں نے پاکستان کے محنت کشوں اور دانش وروں کے ذہنوں کو مارکسزم کی روشنی سے منور کیا ہے۔ پاکستان کے معاشی سماجی اور سیاسی نظاموں کا مارکسزم کے اصولوں سے تجزیہ کر کے ان کی تبدیلی اور ترقی کا راستہ دکھایا ہے۔

انھوں نے اپنے ''لٹ خانہ'' کی تحریروں میں بلوچستان کے سیاسی ورکروں، ادیبوں اور شاعروں کے ذہنوں کو مارکس کے افکار سے روشن کیا ہے۔ اور ماہنامہ ''سنگت'' میں عالمی سرمایہ داری نظام اور پاکستان کے معاشی سیاسی اور سماجی نظام کا درست تجزیہ پیش کر کے ملک کے پڑھے لکھے افراد کی علمی اور فکری خدمت کی ہے۔ ان کا فکر و عمل ناقابلِ فراموش ہے اور پاکستان کی علمی اور عملی تاریخ کا اہم حصہ ہے۔

ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے زندگی بھر علم اور سائنس کی روشنی پھیلائی ہے۔(1)

فاطمہ حسن

عبداللہ جان جمالدینی ان نابغہ روزگار لوگوں میں سے ہیں جو فکر، عمل اور ادراک تینوں سطحوں پر یک رنگ ہیں۔ ان کی شخصیت میں کوئی تضاد نہیں۔ وہ جو سوچتے ہیں وہی کہتے ہیں، جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں اور وہی لکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت سراپا محبت ہے۔ انسانوں سے محبت، کائنات سے محبت، محبت کرنے والوں سے محبت۔ ان کو جس نظریے سے عشق ہے، وہ انہیں ساری زندگی دشتِ غربت کی خاک چھنواتا رہا۔ وہ معاشی انصاف کے حصول میں ناکام سہی مگر ذہنی غربت

کو دور کرنے میں کامیاب رہے کہ اس دشت نوردی میں ایک مختصر کاروان پہلے بھی ان کے ساتھ تھا اب بھی موجود ہے۔ ہر اتوار کو وہ اپنے جیسے لوگوں کے درمیان علم اور تجربے کی روشنی بکھیرتے ہیں۔ اس روشنی نے بلوچستان کے نئے لکھنے والوں کو علم کی راہ، مطالعوں کے رخ اور فکر کے گوشوں کی سمتیں دکھائی ہیں۔ اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ پورے ملک سے جو ادیب و شاعر کوئٹہ آتا ہے شفقت کی ایک لو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔(2)

غوث بخش صابر

پروفیسر میر عبداللہ جان جمالدینی کا نام نوک قلم پر آتے ہی سرِ عقیدت خم ہو جاتا ہے۔ بلوچستان میں فروغِ علم، حقِ خودارایت، روشن خیالی، عجز و انکساری، امن بھائی چارہ اور نہ جانے اور کیا کیا اوصاف ہوں گے جو اس نابغہ روزگار شخص میں مجتمع ہو کر احباب کی نظر میں ان کی قامت کو بڑھاتت ہیں۔ جب کہ میں تو مرحوم آزاد جمالدینی اور میر عبداللہ جان جمالدینی صاحب کو بلوچ قوم اور بلوچی زبان کا محسنِ اعظم سمجھتا ہوں۔ یہ جو بلوچی دو حرف آج لکھے اور پڑھے جا رہے ہیں۔ ان محترم اصحاب کی محنت اور قربانیوں کا صلہ ہے۔ ان محترم ہستیوں نے نہ دولت کی خاطر، نہ نام ونمود کے شوق میں، نہ سرکار دربار میں رسائی کے نقطۂ نظر سے، نہ ہی ادبی طرۂ دستار کی بلندی کے لیے گھر پھونکنے کا عمل کیا۔ ان کی زندگی کا مشن اس خطے میں آزادی، امن، مساوات، اخوت، اور فروغ علم و دانش رہا۔ ان کے اس مشن کی جھلکیاں تو خود ''لٹ خانہ'' کے سلسلہ وار مضامین میں ''سنگت'' کے اوراق پر قارئین کے نظر نواز ہوتی رہتی ہیں۔

جناب عبداللہ جمالدینی بلوچستان کے ان دانش وروں میں سے ہیں جن کی تمام زندگی بلوچستان سے فرسودہ رسوم و روایات کے خلاف جنگ لڑتے ہوئی گزری اور اس جنگ میں انہوں نے بے پناہ صعوبتیں اٹھائیں۔ ان کی تمام زندگی قربانیوں اور جہد مسلسل کی ایک طویل داستان ہے۔ زندگی کے ترقی پسند رویوں کی آبیاری کے لیے انہوں نے اپنا خونِ جگر دان کیا ہے۔ وہ ایک ترقی پسند دانش ور کے طور پر پورے ملک کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کے علم اور روشن فکری نے

نہ صرف بلوچستان بلکہ پورے ملک میں ہزاروں کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کو دھڑکن اور گویائی بخشی ہے بلکہ کئی تیرہ تارہ دماغوں میں ہزاروں قمقمے جگمگائے ہیں۔ اگر کوئی مجھ سے یہ کہے کہ صرف اور صرف دو الفاظ میں ان کی شخصیت کی تعریف کریں تو میں کہوں گا: محبت، شرافت''۔(3)

مراد سامر

عبداللہ جان کی زندگی بلوچ اور بلوچی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔(4)

پروفیسر گل بنگلزئی

میر عبداللہ جان جمالدینی کی زندگی معاشرہ میں رژن (شعور) اور روشن فکری کی علم برداری کی ہے۔ انہوں نے کسی قسم کی تنگ نظری اور تعصب کو اپنے نزدیک نہیں آنے دیا۔ وہ ہر طرح کے شاؤنزم، مذہبی اور گروہی تعصّبات کے خلاف لڑتے رہے ہیں۔ ان کے دل میں انسانی حقوق کا بڑا احترام ہے۔ وہ سیکولرزم کے قائل ہیں۔ مظلوم انسانوں کے حقوق کی وکالت کرتے ہیں۔ جھوٹے فریبی، دھوکہ دینے اور چاپلوسی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتے۔ قبائلی جھگڑوں سے دور رہتے ہیں..... گو کہ وہ خود سردار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ اس ادارے کو بلوچوں کی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

عبداللہ جان جمالدینی مردوں اور خواتین کو یکساں علم حاصل کرنے کی وکالت کرنے والوں میں سے ہیں۔ وہ ان کے درمیان کسی قسم کی تفریق کے حامی نہیں ہیں۔ وہ علم کو بنیادی انسانی حقوق سے جوڑتے ہیں۔ مادری زبانوں میں علم حاصل کرنے کی پرزور وکالت کرتے ہیں۔(5)

ڈاکٹر سید امیر الدین

''کمٹ منٹ کے لفظ پہ آنکھوں میں وہ چہرہ گھوم گیا جس کی شفیق اور مہربان آنکھیں،

جس کا مسکراتا پر خلوص وجود اپنی ضعیفی، جسمانی کم زوری اور بیماری کے باوجود اپنے کمٹ منٹ پر ایک چٹان کی طرح ثابت قدم کھڑا ہے۔ جس کی ذات سے جس کے عزم و آہنگ سے پتہ نہیں کتنے دماغوں کو روشنی ملی اور وہ ذات ہے عبداللہ جان جمالدینی کی۔(6)

محمد علی صدیقی

بلوچی کے بابا' عبداللہ جان جمالدینی سے ملے بغیر آپ کا کوئٹہ کا چکر کیسے مفید ہوگا.....عبداللہ جان جمالدینی بلوچی رائٹرز کے doyen ہیں۔ صوبہ میں ترقی پسند نظریات کے لیے ان کا حصہ بہت اہمیت کا ہے۔ انہوں نے بلوچی رائٹرز اور دانش وروں پر زبردست اثرات ڈالے اور وہ صوبہ کی دانش ورانہ زندگی میں رہنمایانہ رول ادا کرتے رہے ہیں۔(7)

علی کمیل قزلباش

ان کے نزدکوئی بھی فرد یا شئے جو انسان کی قدر میں حائل ہو وہ قابلِ نفرت ہے۔ وہ عبد ہیں، اور عبد سے محبت کرتے ہیں۔ عبد رہنا اور عبد رہنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ نہ معبود بنتے ہیں، نہ معبود بننے والوں کو پسند کرتے ہیں۔(8)

افضل مراد

ماما عبداللہ جان نرم لہجے کی ردا ہیں(9)

انور احسن صدیقی

جمالدینی صاحب کی زندگی تمام لوگوں اور خاص طور سے نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے جو انسانی سماج کو مثبت انداز میں بدلنے کی خواہش اپنے دلوں میں رکھتے ہیں

اوراس جدوجہد میں شریک ہونا چاہتے ہیں جواگرچہ تاریخ کے اس موڑ پر کافی کم زور پڑ چکی ہے لیکن یقین ہے کہ آنے والے وقت میں یہی جدوجہد انسان کی نجات کا وسیلہ قرار پائے گا۔(10)

بیرم غوری

اس سماج میں خدا پرست تو بہت ہیں لیکن انسان پرست کتنے ہیں ۔انسان دوستی اورانسان پرستی کے اسی عقدہ کی کتاب ''لٹ خانہ'' گرہ کشائی کرتی ہے۔(11)

ظفر معراج

بلوچستان میں امن ،محبت اوررواداری کا سنگ بنیاد وہ درخت ہے جس پہ مست توکلی نے اپنی تلوار لٹکائی تھی ۔اور یہ بول کرلڑنے سے انکار کردیا تھا کہ میں جنگ کی بولی نہیں بولوں گا کیوں کہ یہ دوست کودوست سے جدا کردیتی ہے۔اس درخت نے بعد میں جوپھل دیے،عبداللہ جان جمالدینی ان میں سے ایک ہیں۔

''لٹ خانہ'' محض تاریخ نہیں ہے ۔لٹ خانہ حال بھی ہے۔ وہ آج بھی سریاب روڈ کےفیض آباد میں اسی طرح قائم ہے جیسے قائم ہوا تھا۔آج بھی سارے بلوچستانی وہاں ویسے ہی جمع ہوتے ہیں،جیسے ماضی میں جمع ہوتے تھے۔آج بھی وہاں غرور،انا،سازش اور بدنیتی کی سوچ دم توڑتی ہے ۔آج بھی وہاں محبت ،عشق ، رواداری اور امن کی بات ہوتی ہے ۔آج بھی وہاں بلوچستان اوربلوچستانیوں کے یورینیم اور چیک پوسٹوں سے گھٹی ہوئی سانسوں کی بحالی کی خیرات ہوتی ہے ۔آج بھی وہاں اپنے لوگوں کی معصومیت کے استحصال کا نوحہ پڑھاجاتا ہے ۔آج بھی وہاں لڑانے والے سرداروں ، بکنے والے سیاستدانوں اور بجھنے والے دانش وروں کی ہدایت کی دعا کی جاتی ہے۔(12)

وحید زہیر

عبداللہ جان لکھتے لکھتے روتے ہیں،روتے روتے چیختے ہیں،چیختے چیختے خاموش ہوجاتے ہیں کیوں کہ ان کے غلام محمد شاہوانی ، ملک عثمان ،کامل القادری ،گل خان نصیر،عبدالرحیم خواجہ خیل، میرغوث بخش بزنجو ودیگر جگری دوست بولتے بولتے ،تولتے تولتے ،لڑتے لڑتے جداہوگئے ہیں ۔ ڈاکٹر خدائیداد، میر کمال خان ،انجم قزلباش اور باقی دوست صرف انھیں یادکرنے اورآنسو بہانے کے لیے زندہ ہیں۔ان کے شاہ محمد مری،سرورخان، پروفیسر برکت،شیام کمار اپنے پیاروں کوسوچ سوچ کر اپنے لٹ جذبات کی ترتیب کے لیے معاشرے کی بے ترتیبی سے لڑرہے ہیں۔اور جب کبھی تھک جاتے ہیں،توبابا عبداللہ کی پائنتی میں بیٹھ کرروتے روتے ،سسکتے سسکتے سکون پاتے ہیں۔(13)

محمد اشرف غمگین

''عبداللہ جان جمالدینی کا نام استعارہ ہےصدقہ جاریہ کا۔اور یہ صدقہ جاریہ جمالدینی فکرِ نو کے بطور قیامت تک جاری رہے گا۔ اور اس سے مظلوم طبقات فیضیاب ہوں گے۔عدم مساوات کا خاتمہ،استحصال سے پاک غیرطبقاتی معاشرہ کے قیام تک عبداللہ جان جمالدینی صاحب کا نام تحریک کوحرارت اورحرکت کوکیفیت اورکمیت کے اعتبار سے آگے لے جائے گا۔عبداللہ جان جمالدینی کی نگارشات مظلوم مخلوق کے دلوں کی آواز اوردھڑکن ہیں ۔ان کی تحریریں تواہم،جہل، ظلم،فقرکا توڑ ہیں ۔امن ،خوش حالی ، ترقی کا پیغام ہیں ۔عبداللہ جان نے تاریخ کے نام پرمروجہ روایاتی قصے کہانیوں کوتنقید کا نشانہ بنایاہے ۔اور تاریخی وجدلیاتی مادیت کے تناظر میں تہذیبوں کا مطالعہ کیاہے''۔(14)

سیف الدین بوہرہ

......اپنی محفل میں ایک گلدستہ بنے رہے،جس کی خوشبو سے ہم مہکتے رہےاوررنگوں کی

لذتوں سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے رہے۔ ایسی صوفیانہ زندگی گزارنے والے کہ میں انہیں درویش کہہ سکتا ہوں.....(15)

سرور آغا

''جس محفل میں ان کا ذکر ہوتا ہے، سراحترام اور نیاز مندی سے جھک جاتے ہیں۔''(16)

ننگر چنا

''یہ نام لوتو شاہ لطیف کی سسی کی جدوجہد، مارئی کی حب الوطنی، نوری کا نیاز و عجز اور سوہنی کی بغاوت اور بہادری، سب باہم اکھٹے ہوکر ایک شخص کا جنم ہوتا ہے؛ وہ شخص یہی ہے''۔(17)

ڈاکٹر عطا اللہ بزنجو

ایک شفیق باپ، کامل استاد، ایک غم گسار دوست، کبھی مایوس نہ ہونے والا سیاسی ورکر، اپنے نظریات اور فیصلوں پر سٹینڈ رکھنے والا عاشق، ایک محنت کرنے والا شخص.....چھوٹا بڑا بچہ، مرد اور عورت بلاتفریق رنگ و نسل مذہب و جنس بابا سب سے پیار کرتے ہیں اور پیار کرنا سکھاتے ہیں..... جو شخص پوری دنیا سے محبت کرتا ہے، تمام انسانیت کی بھلائی کے لیے سوچتا ہے، ہر قوم ہر نسل ہر مذہب کا احترام کرتا ہے تو اپنی قوم کے دکھ زدہ اور مفلوک الحال عوام کے لیے اس کا دل کیسے نہیں تڑپتا ہوگا۔(18)

*****

منظوم خراجِ عقیدت

مولانا عبدالکریم ظہیری

یک نیک مرد است مردِ فطین
عبداللہ جان و را نام نامی بود
کہ در علم چون جام جامی بود
شناسائے دھر است صاحب فنون
دلش مہر دار دبحدِ جنون
بمہر عزیزاں چوں جاں دربدن
بکر دار گفتار در عدن

(19)

شرافت عباس

عجیب فن کار ہے کہ معمار ہے کہ درویش گل بکف ہے
پرانے موسم کے رت جگوں سے
نئے سویرے تراشتا ہے
وہ شمعِ حسنِ نظر سے
راتوں کے گلبدن کو
قبائے تنویر بخشتا ہے
کہ اس کے لہجے سے پھوٹتی ہے
جمالِ صبحِ یقیں کی خوشبو
کہ اس کی باتوں سے
کھلتے جاتے ہیں باب، ایوانِ آگہی کے
وہ علم وفکر و ہنر کی وادی میں
کب سے آواز دے رہا ہے
وہ اپنے ذوقِ یقیں کا ہدیہ برنگِ اعجاز دے رہا ہے
جمالدینی محبتوں کے سفیر، تیرا ہنر سلامت
متاعِ فکر ونظر سلامت
یقین وذوقِ ہنر سلامت
تو ایک فن کار ہے
کہ معمار ہے
کہ درویشِ گل بکف ہے (20)

شبینہ رفعت

یہ جو سامنے بیٹھا ہے
میرا بھی کچھ لگتا ہے
باہر سے یہ جیسا ہے
اندر سے بھی ویسا ہے
کس سے کیسے ملنا ہے
سب سے بہتر جانتا ہے
دور بہت رہ کر بھی یہ
سب میں چھپ کے بیٹھتا ہے
تتلی اور خوشبو کا سا (جیسا)
اس کا مجھ سے رشتہ ہے
آنے جانے والوں سے
میرا پوچھتا رہتا ہے
میرا جیون کیسا ہے
اکثر سوچتا رہتا ہے
باہر سمٹا سمٹا یا
اندر کتنا پھیلا ہے (بکھرا ہے)
جب بھی اس سے ملتی ہوں
رنگ افکار کا نکھرا ہے
ایک چمکتا ہیرا ہے
دھوپ سی اس کی دوری ہے

پیڑ سا اس کا سایہ ہے
دھنک سی اس کی چاہت ہے
بارش جیسا رشتہ ہے
اس کا سر بھی قلم کر دو!
اس نے بھی سچ بولا ہے!!

(21)

محسن شکیل

دیے کی لو میں چھپی رہگزار دیکھتا ہوں
سفر میں اس کی طرف بار بار دیکھتا ہوں
بدلتا چاہتا ہے کون اس خرابے کو
کہ دشتِ دل کی طرف اک سوار دیکھتا ہوں
یہی قلم تھا کہ تنہا تھا گھپ اندھیروں میں
یہی چراغ کہ اب بے شمار دیکھتا ہوں
ہیں ایک درد کے رشتے میں سب پروئے ہوئے
میں دھڑکنوں میں یہی ایک پکار دیکھتا ہوں
میں دشتِ خواب میں تنہا چلا تھا زخم لیے
اب اس چمن کو مگر لالہ زار دیکھتا ہوں
یہ آسمان مجھے آسماں نہیں لگتا
جو اس خلا میں کبھی آر پار دیکھتا ہوں
وہ کھو گیا ہے تو صحرا میں کیا ملے گا مگر
چلو یہاں بھی اسے میں پکار دیکھتا ہوں
وہی سفر ہے، وہی لُو ہے، رہگزار وہی
مگر میں اب کے دلوں کی قطار دیکھتا ہوں
زقند بھر کے فضا میں اڑان کھینچی تو
پروں کے واسطے کھینچا حصار دیکھتا ہوں

(22)

حوالہ جات

1۔اسلم، سی آر''عبداللہ جان جمالدینی''۔ماہتاک سنگت کوئٹہ۔اگست2002۔صفحہ 45

2۔فاطمہ حسن''ہمبوئیں سلام''ماہنامہ سنگت کوئٹہ جولائی2006۔

3۔غوث بخش صابر''کتابوں پر تبصرہ''۔ماہنامہ سنگت جون2000۔صفحہ 46

4۔یہ خوبصورت فقرہ مراد ساحر مرحوم نے اپنے آخری دورہ کوئٹہ میں عبداللہ جان کے گھر میں کہا تھا۔

5۔گل بنگلزئی۔دیباچہ جمالدینی کی کتاب۔شمع فروزاں2006۔سنگت اکیڈمی آف سائنسز کوئٹہ۔ صفحہ 14

6۔امیر الدین، ڈاکٹر۔آخری صفحہ۔ماہنامہ سنگت جنوری2001 صفحہ 56

7-صدیقی، محمد علی روزنامہ ڈان کراچی۔28 مئی2003

8- قزلباش۔علی کمیل۔ماما جمالدینی درویشِ توانگر۔ماہنامہ سنگت۔جون2007۔صفحہ 7۔

9۔افضل مراد۔ماہنامہ سنگت۔فروری2005۔صفحہ 8۔

10۔صدیقی۔انور احسن۔''جمالدینی۔۔۔ایک تاریخی قوت''۔اگست2002 صفحہ 48

11۔غوری، بیرم۔ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔اگست2002۔صفحہ 50

12۔ظفر معراج۔بلوچستان کا گوتم۔ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔اگست2002۔صفحہ 51

13۔وحید زہیر۔مردہ شہر کی زندہ تاریخ۔ماہنامہ سنگت۔کوئٹہ۔اگست2002۔صفحہ 52

14۔غمگین، محمد اشرف''مبارک باذ''۔ماہنامہ سنگت۔اپریل2005۔صفحہ نمبر 5

15-بوھرہ، سیف الدین۔سنگت، فروری2005ء۔صفحہ 12

16۔سرور، آغا''گواڑخ سدا بہار''ماہنامہ سنگت۔جنوری2003۔صفحہ 60

17۔ننگر چنا۔جوگی پر محبت نے نور کا ہالہ بنا رکھا ہے۔ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔اگست2005۔صفحہ 83

18-بزنجو، عطا اللہ، سنگت فروری2005۔صفحہ 10

19۔عبداللہ جان نے''گلستان سعدی''مولانا عبدالکریم ظہیری کو تحفتاً بھیجی۔وصول ہونے کی رسید مولانا نے فارسی شاعری میں ادا کی۔

20۔آرٹس کونسل کوئٹہ میں منعقد کردہ''جشن عبداللہ جان''کے موقع پر پڑھی گئی۔

21۔ثبینہ رفعت، ماہنامہ سنگت۔فروری2005، صفحہ 20

22۔محسن شکیل، ماہنامہ سنگت، فروری2005

بشر کی گردن، اور موت کا چنگل

عبداللہ جان جمالدینی طویل علالت کے بعد 19 ستمبر 2016 کو رات سوا آٹھ بجے فوت ہوگیا۔

وہ ہمارا استاد، دانش مند، گائیڈ اور راہنما تھا۔ راست گو، راست باز، عالم، باوقار، ہم سب کو Own کرنے، سایہ مہیا کرنے والا، باکمال انسان، پیار و محبت میں ڈھلا اشرف انسان، بلوچستان کا نرم چہرہ اور اس کی مضبوط آواز، بچھڑ گیا۔

ایک متحرک و برکتی طویل زندگی کے مزے لے کر اور اچھائیاں بانٹ کر 94 برس کے بعد پچھلی اچھی نسل کے آسمان کا دمکتا ستارہ ماما عبداللہ جان جمالدینی اس فانی زندگی سے پردہ کر گیا۔ جب ایک نیک اور متحرک شخص چورانوے برس تک زندہ رہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نے انسان کی بھلائی کی کیا کیا خدمات سرانجام دی ہوں گی۔ اور یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا خلا ایک شخص نہیں بلکہ بلند افکار وارفع اعمال کے حامل ''کئی'' اشخاص مشترک و واحد بن کر پُر کرسکیں گے۔

وہ وصیت نہ بھی کرتا تو بھی نوشکی ہی میں اس کی قبر بنتی کہ گور تو اپنے آبائی گورستان میں ہوتی ہے۔

مگر وہ یہاں بھی ایک انہونی کر گیا۔ جس طرح زندگی میں اُس نے کبھی سولو فلائٹ نہ کی تھی، اسی طرح وفا کے اس خزینے کو اکیلا مرنے بھی نہ دیا گیا۔ اُسے اس سفر میں بھی اس کے شایانِ شان رفیق عطا ہوئی۔ جیلوں، بے روزگاریوں، اور تنگ دستیوں بھری مشترک زندگی گزارنے والی اس کی محبوبہ بیگم بھی اُس کے ساتھ روانہ ہوئی۔ دونوں پیر سال محبوب اپنی اپنی بیماری اور بے ہوشی کے ہاتھوں ایک دوسرے کی موت کا غم دیکھے بغیر مر گئے۔ بچوں کے ہرے بھرے گھر کو ویران بنانے اور ویران قبرستان کو نورستان بنانے والے ماں باپ دونوں ایک ہی روز چل بسے۔

یہ تھی ایک انہونی، ایک نئی تاریخ، ایک نئی مثال، ایک نئی ضرب المثل۔ سچ ہے کہ بیماری کے ہاتھوں موت کا وقت اور دن، مرنے والا خود متعین نہیں کرسکتا۔ البتہ اس باوفا، محبت بھری جوڑی نے ایک ہی دن انتقال کر کے ایک نئی سٹوری، اور ایک نئے ناول، ایک نئی فلم کا موضوع اور سکرپٹ ضرور عطا کر دیا۔

یاد رہے کہ دانا اور انقلابی انسان، گوشت پوست میں تو کسی قبیلے قوم سے ہوتے ہیں، مگر فیض میں بین الاقوامی ہوتے ہیں۔ برکت بانٹنے میں مکمل انٹرنیشنلسٹ!!۔ لہٰذا اس کے جنازے کا جلوس بھی بین الاقوامی تھا۔ بہت زبانیں بولنے والے لوگ تھے اُس کی قبر پر!!

اُس روز ''عشاق کا قافلہ'' ایسے حال میں نوشکی کی طرف رواں دواں تھا کہ اس کی قیادت اُس کا سربراہ خود کر رہا تھا.....فرق یہ کہ اب اُس کی یہ آخری بار کی قیادت تھی۔ اور ہمیشہ کے برعکس آج یہ قیادت ''خاموش'' تھی۔ تیسرا فرق یہ تھا کہ اب کی بار یہ قیادت صرف یک طرفہ تھی، کوئٹہ سے نوشکی کی طرف۔ واپسی پر قافلے کو نئی قیادت (نئی مشترکہ قیادت) میں کوئٹہ لوٹنا تھا۔

قصہ مختصر، ایک دن میں دو میتیں اٹھیں، اور دو ایمبولنسیں چلیں۔ نوشکی کے بٹو گاؤں میں عبداللہ جان کے بیٹے بالاچ کے گھر ہزاروں انسانوں نے ''دیدار'' کی انسانی رسم ادا کی۔ ڈیڑھ میل کے فاصلے پر قبرستان تھا۔ بے شمار لوگ میتوں کے پیچھے پیچھے قبرستان جا رہے تھے۔ مضمحل جسموں ایقانوں والے تو گاڑیوں موٹر سائیکلوں پر، اور صحت مند (اور رجعت کی حد تک عبداللہ جان سے کمٹ منٹ والے بے صحت بھی) پیدل۔

اور جب ہم لپک لپک کر کبھی ماما کی میت کو کندھا دے رہے تھے اور کبھی اپنی کامریڈ مامی کے جنازے کو، تو دور دیس سے صدیق آزاد کا میسج آیا: ''مڑا ھد اریں براہمدغ۔ کاش بلوچ سرزمین سے ہزاروں میل دور، میں بھی آج بلوچستان کے نیک اور پاک ولیوں کی میتوں کو کندھا دینے، جنوب مغرب کی جانب رواں تمہارے کارواں کے ساتھ ہوتا۔ مگر یہ نیک بختی تمہارے نصیب میں آئی۔ البتہ تم سے یہ خواہش ضرور کرتا ہوں کہ بلوچ وطن کی سرمگیں پاک خاک سے ایک مٹھی میری جانب سے بھی ولیوں کی آرام گاہ پر رکھ لینا، میں تیرا لاکھ شکر گزار رہوں گا''۔

جڑواں قبروں کے بیچ ایک فٹ کے جزیرے پر کھڑے ہم سوچ رہے تھے کہ میر عبداللہ جان کی شکل میں ایک پہاڑ گر گیا۔ اور اس سفر میں باوفا اور محنت کیش بشر دوست مامی زبیدہ جان کی صورت ایک اور پہاڑ گر گیا۔ اور یہ دونوں پہاڑ عام پہاڑ نہیں تھے بلکہ یہ گرم بلوچستان میں ایسے کوہِ گراں تھے جو پیپل، پرپغ، جنگلی انار، شیریں کونر، اور معطر'' مزن سر'' نامی درختوں جھاڑیوں سے سرسبز تھے۔ سرد اور شیریں چشموں ندیوں سے سیر آب پہاڑ۔ نور اور برکتیں بانٹنے والے پہاڑ۔ کمٹ منٹ اور انسان دوستی کے بلند پہاڑ!!

کوئٹہ میں گرنے والے یہ باوقار پہاڑ، بہت دور نوشکی کے بٹو گاؤں کے مشرقی وسیع میدان میں دو جڑواں گران و باوقار پہاڑ بن کر دوبارہ اُگ گئے۔ اب کے، ہمارے سفر کی نشانی کے بطور بھی، اور آنے والے قافلوں کی سمت و منزل کا تعین کرنے والے سنگِ میل کے بطور بھی۔

موت کا اجتماع منحوس ترین اجتماع ہوتا ہے۔ تلخ جیسے وکٹر ہارا کا آخری گیت.....
مگر یہ والی موت محض موت نہ تھی۔ یہ تو دانائی کا اُجڑ جانا تھا۔

اور وہ دانا بھی کیا دانا ہوگا جس کی حتیٰ کہ قبر میں سے بھی دانائی نہ پھوٹے۔ گو کہ آج یہاں مری قبیلے کا کوہِ جاندران نہ تھا اور نہ مرنے والے کا نام پیرک تھا۔ مگر نہ جانے کیوں جب آج تین فٹ زیرِ زمین لیٹے شخص کی قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی تو اس دبیز گرد و غبار میں کانوں میں میٹھے سرینڈا کا احتجاج ٹکرایا:

''کاش تُو اپنے ماما مامی کی رواج شکن موت سے ہی ہمت پکڑتا، اور کم از کم ہم دونوں کے جنازوں اور تدفین میں میری بیٹیوں کو لے آتا!!''۔

ہم مارشل دُھن میں لپٹا اُس کا یہ سوال روشن فکر انسانوں تک منتقل کر رہے ہیں۔

ضمیمہ جات

ریاست متحدہ بلوچستان کے مستقبل کا سوال
مسئلہ کشمیر کی روشنی میں

بلوچ متحدہ ریاست کے مختلف قبائل کُرد، محمد شاہی، سمالانی، پرکانی، سرپرہ و
لہڑی وغیرہ کے سرکردہ، اکابرین، معتبرین اور مقدمین کا مشترکہ بیان

بلوچستان سٹیٹ یونین کو ختم کر کے بلوچستان ایجنسی (ایجنٹ گورنر جنرل کے زیر انتظام علاقہ) کے ساتھ ملا دینے کی تجویز یونین کے چند ایک قبائلی سرداروں کے علاوہ یونین کے باہر بعض ایسے لاتعلق لوگوں کی طرف سے بھی اٹھی ہے، جو اپنی ذات کے ماسوا اور کسی کے نمائندہ ہونے کی حیثیت نہیں رکھتے اور کہا جاتا ہے کہ پاکستان گورنمنٹ بھی اس پر غور کر رہی ہے بلکہ بلوچستان کے ایک دو مقامی اخباروں کا دعویٰ ہے کہ پاکستان گورنمنٹ اس تجویز کو منظور کر چکی ہے اور صرف اس کا اعلان کرنا باقی ہے۔

ہم اس مسئلہ پر کسی دیباچہ، تمہید اور سخن سازی کے بغیر پاکستان گورنمنٹ، پاکستان دستور ساز اسمبلی اور پاکستان پارلیمنٹ کے معزز اراکین کی خدمت میں صرف یہ عرض کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ کشمیر کے الحاق ہند کے متعلق اگر پاکستان گورنمنٹ اور اس کی پبلک، ہز ہائنس مہاراجہ کشمیر اور

کشمیر سٹیٹ اسمبلی کے فیصلوں کو جائز اور آئینی تسلیم نہیں کرتی ہے اور ریفرنڈم کا مطالبہ کیا جارہا ہے تو پاکستان گورنمنٹ بلوچ سٹیٹ یونین کے معاملہ میں اپنے اس آئینی اصول اور مؤقف کو کیوں نظر انداز کررہی ہے؟ اور بلوچ سٹیٹ یونین کی ہزار سالہ تاریخی اور آئینی حیثیت رکھنے والی اسلامی ریاست کو عوامی خواہش اور عوامی ریفرنڈم کے بغیر صرف چند ایک سرداروں کی ذاتی خواہش پر توڑ کر بلوچستان ایجنسی کے ساتھ ملانے کی تجویز پر حوصلہ افزائی کے انداز میں کیوں غور کررہی ہے۔

1- کوئی اہلِ نظر آئین شناس اور سیاست دان اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ اگر پاکستان گورنمنٹ نے بلوچ سٹیٹ یونین کے زیر بحث مسئلے کو عوامی خواہش کے خلاف اور عوامی رائے معلوم کرنے کے بغیر صرف مذکورہ چند سرداروں کی خواہش کے مطابق حل کیا تو دنیا کے بین الاقوامی حلقوں میں کشمیر کے متعلق پاکستان کا مؤقف اس کے اپنے ''اس قول و فعال میں تضاد'' ہونے کی وجہ سے خود بخود ختم ہوکر رہ جائے گا۔ لہٰذا بلوچ سٹیٹ یونین کے مستقبل کے متعلق یہاں کے عوام کی خواہش اور ان کی رائے حاصل کئے بغیر پاکستان گورنمنٹ کو کسی قسم کی کوئی کارروائی پر عمل کرنے سے بہرحال اجتناب کرنا چاہیے۔

2- بلوچ یونین کے صرف ایک حصہ کے اگر چند ایک سرداروں نے کوئی ایسی خواہش یا تجویز پیش کی ہے یا کسی ایسی تجویز کا خیر مقدم کیا ہے تو واضح رہنا چاہیے کہ سرداروں کو بفرضِ محال اگر کوئی نمائندہ حیثیت حاصل بھی ہو، تو یہ ایک اظہر من الشّمس حقیقت ہے کہ وہ صرف ان کے قبائل کے ایک قلیل حصہ تک محدود ہے اور بلوچ سٹیٹ یونین میں قبائل کے ان محدود اور قلیل حصوں کے علاوہ دوسرے عوامی لوگ بھی لاکھوں کی تعداد میں آباد ہیں۔ اور ایسے عوامی لوگ سرداروں کے زیر اثر محدود حصہ قبائل کی آبادی سے زیادہ اکثریت رکھتے ہیں اور پھر جب کہ خود ان سرداروں کی اکثریت نے بھی اس خواہش اور تجویز کو واپس لینے کا بروقت فیصلہ کرکے مرکزی حکومت کو آگاہ کردیا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ ہر لحاظ سے عوامی خواہش و رائے کے بغیر کوئی فیصلہ کرنا غلط اور آئین و جمہوریت کے سراسر خلاف ہوگا۔

3- پاکستان گورنمنٹ نے ریاستوں کے الحاق کے سلسلے میں قانونِ آزادی میں طے

شدہ مضمون کے مطابق جو عہد نامہ جات قبول کیے ہیں، اُن میں ریاستوں کی آئینی حیثیت، ان کے حکمرانوں کے حقوق، اختیاراتِ حکمرانی وغیرہ کو دوامی طور پر نسلاً بعد نسل قائم اور محفوظ رکھنے کی شرط پاکستان گورنمنٹ نے خصوصیت کے ساتھ تسلیم کی ہے، لہٰذا مقدس قران اور پاکیزہ سنت رسولؐ کے اسلامی آئین کی رُو سے اور خصوصاً پاکستان جیسی پابندِ قرآن وسنت اسلامی حکومت پر یہ فرض خصوصیت کے ساتھ عائد ہوتا ہے کہ بلوچ سٹیٹ یونین اور اس کے حکمرانوں کے ساتھ اجتماعی اور انفرادی طور پر طے کردہ عہد نامہ جات پر پوری طرح سے پابند رہے اور ان مشوروں، تجویزوں اور خواہشات کو کسی پہلو سے بھی درخور اعتنا اور قابلِ پذیرائی نہ سمجھے، جو اپنے اندر درپردہ پاکستان گورنمنٹ کو مذکورہ بالا عہد نامہ جات کے نظر انداز کرنے، پیمان شکنی، وعدہ خلافی اور نقض عہد کی راہ پر ڈالنے والی ترغیبات اور تحریکات مضمر اور پوشیدہ رکھتی ہیں۔

4- عہد نامہ جات کے علاوہ ویسے بھی یہ امر مقدس قرآن اور پاکیزہ سنت اور اسلامی جمہوری آئین کی رُو سے پاکستان گورنمنٹ کے لیے جائز نہیں ہوسکتا کہ عوامی خواہش اور رائے کے بغیر صرف ایک طبقہ کے چند سرداروں اور بعض لاتعلق اور غیر نمائندہ عناصر کی خواہش پر تاریخ اسلام کے ابتدائی دور کی قائم شدہ ایک متحدہ اسلامی ریاست کو (جو کسی حکمران کی خاندانی میراث اور جاگیر نہیں بلکہ عوام کے آباؤ اجداد کی جو قرونِ اولیٰ کے مسلم مجاہدین اور فاتحین اسلام تھے۔ قائم کردہ ایک اسلامی جمہوری حکومت ہے) ختم کرکے کسی ہمسایہ ایجنسی ایڈمنسٹریشن کا جزو بنا دینے کا فیصلہ صادر کرے۔ اگر پاکستان گورنمنٹ نے قران وسنت کے اسلامی جمہوری آئین کے خلاف رائے عامہ کو نظر انداز کرتے ہوئے بلوچ سٹیٹ یونین کو ختم کرنے کا کوئی فیصلہ کیا تو واضح رہنا چاہیے کہ عوام کے ہزارہا لوگ حکومت پاکستان کے اس فعل کے قرآن وسنت کے برخلاف ہونے کے متعلق سپریم کورٹ میں زیر دفعہ نمبر آئین پاکستان ہزاروں مقدمات دائر کرنے پر آمادہ ہیں۔

5- زیر بحث مسئلہ کے متعلق 16 مارچ 1954 کو اراکینِ دستور ساز اسمبلی دولت پاکستان کے نام خیر خواہانِ پاکستان قوم بلوچ اور بلوچستان کی جانب سے ایک مطبوعہ عرض داشت اردو اور انگریزی میں، ''مسئلہ بلوچستان اور اس کا واحد حل'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ ہم اس

کی کلیتًا اور حروف بحرف تائید کرتے ہوئے مطالبہ کرتے ہیں کہ بلوچ قوم کی عوامی خواہش کے مطابق:

(الف) بلوچستان ریاستی یونین کو جو اصل اور قدیم بلوچستان ہے بلوچستان کی بنیاد تسلیم کی جائے۔

(ب) ریاست قلات کے ان علاقوں کو جو انگریزی عہد اقتدار میں اجارہ پر لیے گئے تھے، بمع دوسرے بلوچ قبائلی علاقہ جات کے، بلوچ سٹیٹ یونین کے ساتھ شامل کیا جائے۔

(ج) بلوچستان ایجنسی کے زیر انتظام پٹھانی علاقوں کو صوبہ سرحد میں ملا دیا جائے، جیسا کہ ان کی عوامی خواہش ہے۔

1- میر عبدالعزیز خان کُرد
2- میر محمد اعظم خان شاہوانی
3- حاجی میر شیر دل خان کُرد
4- ٹکری محمد امین خان کُرد
5- میر علی جان کُرد
6- میر گل محمد کُرد
7- ٹکری جمعہ خان کُرد
8- ٹکری عبدالوہاب کُرد
9- میر امیر جان محمد شاہی، مستونگ
10- میر خان محمد شاہی، آس تنگی
11- میر حضور بخش محمد شاہی، شیریں آب
12- سردار محمد عظیم خان پرکانی
13- میر عارف خان سرپرہ

14- میر عبدالکریم سرپرہ، مرعی
15- میر مراد خان سرپرہ
16- ٹکری مزار خان نوتک زئی، سرپرہ
17- ٹکری پسند خان آدم زئی، سرپرہ
18- ٹکری عزیز اللہ خان سومار زئی، سرپرہ
19- میر محمد صدیق سرپرہ
20- ملک میر احمد خان سمالانی
21- ملک محمد خان سمالانی
22- میر شیر محمد خان سمالانی
23- ملک نور محمد لہڑی، قلات
24- پیر بخش خان لہڑی
25- میر ہزار خان سرپرہ
26- میر نور محمد محمد شاہی کوہک
27- میر بدل خان محمد شاہی

ضمیمہ نمبر 2

ہمارا بلوچستان

غلام محمد شاہوانی

عبداللہ جان جمالدینی

بلوچستان اور بلوچستان ریاستی یونین کے متعلق ہفتۂ سبی کے دوران ریاستی یونین کے قبائلی سرداروں کی طرف سے ایجنٹ ٹو گورنر جنرل بلوچستان کو جو عرض داشت پیش کی گئی ہے، اس سے بلوچستان اور ریاستی یونین کی سیاسیات کا متاثر ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ لیکن اس اہم اور سنگین مسئلہ کو سنجیدہ غور وفکر کے بجائے سطحی اور جس خالص جذباتی انداز میں سلجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس سے سیاسی شعور کے فقدان اور خلوص و دیانت کے زنگ آلود ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔

سرداروں کی اس تحریک سے جس کی تہہ میں خود حکومت کا اشارہ کارفرما ہے، والیانِ ریاست کا دو وجوہات کی بنا پر سیخ پا ہونا خلافِ توقع نہیں۔ اول تو یہ کہ مجوزہ اتحاد سے والیانِ ریاست کے اقتدارِ اعلیٰ کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ دوم یہ کہ وہ ہر قسم کی نمائندگی کو اپنے لیے محفوظ تصور کرتے ہیں لیکن عوامی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والے مصلحت بین، موقع پرست اور طالع آزما لوگوں کی طرف سے والیانِ ریاست کے مفاد کی خاطر سادہ لوح عوام کو گم راہ کرنے کی کوششیں یقیناً

افسوس ناک ہیں۔ اس سلسلہ میں مختلف لوگوں کی طرف سے پمفلٹوں کی اشاعت مفاد پرستی اور عوامی مفاد سے مجرمانہ گریز کی بدترین مثالیں ہیں۔

بلوچستان اور ریاستی یونین کے اتحاد کی تحریک سے سرکاری حکام کی غیر معمولی دلچسپی کا مقصد اگر بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ اور یونین میں انتخابات کو مزید عرصہ تک التوا کی نذر کرنا نہیں ہے تو پھر اس تجویز کی تفصیلات سے عوام کو بے خبر رکھنا اور بلوچستان کا مستقبل معین کر کے اپنے آپ احساسات سے بے نیاز رہنا ایک ایسی کوتاہی ہے جن سے مفاد پرستوں کو عوام کے ذہنوں کو زہر آلود کر کے حکومت کو اس بات پر مجبور کرنے کا موقع ملتا ہے کہ وہ مفاد پرستوں کی شرائط تسلیم کرے۔ ریاستی یونین کے قیام کے وقت بھی اس قسم کی غلطی کا ارتکاب ہوا تھا۔ اس کے نتائج آج ہمارے سامنے ہیں۔

والیانِ ریاست اور نوکر شاہی کے گٹھ جوڑ سے یونین کے عارضی آئین کے ان دفعات کو التوا میں ڈال دے گا جن کا تعلق عوامی حقوق یا عوامی فلاح و بہبود سے ہے کیوں کہ یونین میں مجلس قانون ساز کا قیام اگر والیانِ ریاست کو نا گوار ہے تو پبلک سروس کمیشن کے قیام سے نوکر شاہی کی خویش پروری اور اقربا نوازی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یونین میں دو سال کے طویل عرصے میں والیان ریاست کی ہر جائز و نا جائز خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور نوکر شاہی کو بلا شرکت غیرے حکومت کرنے کے مواقع بہم پہنچائے گئے ہیں۔ اگر کوئی چیز تشنۂ تکمیل ہے تو وہ مفلس و بے خانمان عوام کی آبادی اور فلاح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اعتبار سے مطمئن والیانِ ریاست ایک نئی تبدیلی کے خوف سے بوکھلا اٹھے ہیں اور ان کے ترجمان مفلوج ذہنیت کا ثبوت دے کر مضحکہ خیز مطالبات کے ذریعے ان کی تسکین کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔

''مسئلہ بلوچستان اور اس کا واحد حل اور ریاست ہائے متحدہ بلوچستان کے مستقبل کا سوال، مسئلہ کشمیر کی روشنی میں'' کے عنوان سے جو پمفلٹ شائع کیے گئے ہیں، ان کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ والیانِ ریاست کا اقتدار بحال رہے، ان کے جبر وسطوت میں فرق نہ آئے اور ان کی مطلق العنانی برقرار رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس جمہوری دور میں کوئی بھی ذی ہوش

لاکھوں افراد کی نعشوں سے چند لوگوں کے لیے پرشکوہ محلات کی تعمیر کی حماقت نہیں کرسکتا۔ اس لیے ہمیں یقین ہے کہ کوئی سمجھ دار فرد جو والیوں، سرداروں اور موجودہ قبائلی نظام کی عوام دشمنی سے واقف ہے، ایسے فرسودہ نظام کو مزید ایک لمحہ کے لیے بھی عوام پر تھوپنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا۔

والیانِ ریاست، سرداروں اور اس فرسودہ نظام کے خاتمہ سے یونین کے ننگے، بھوکے تباہ و برباد عوام کو اپنی غلامی کی زنجیریں کھونے کے علاوہ اور کوئی نقصان نہ ہوگا۔ بھلا زنجیروں کے علاوہ ان کے پاس کھونے کے لیے رکھا ہی کیا ہے، جس کا انہیں ڈر ہو۔ مستجار علاقوں کی واپسی کا جس انداز میں مطالبہ کیا جارہا ہے، اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسے حیوانوں کی آبادیاں ہیں جنہیں ان کا مالک جب چاہے گروی رکھے، اجارہ پر دے، یا فروخت کردے۔ لیکن ہمیں ان علاقوں میں آباد انسانوں کے جذبات و احساسات کا احترام ہے۔ ہم نہ تو انہیں کسی فرد کی ملکیت تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی اس مطالبہ کے ذریعے سودا بازی کو جائز قرار دے سکتے ہیں یا سنڈیمن کا حوالہ دے کر بلوچستان کی نئی تشکیل کا دعویٰ نہیں کرنا ہے۔

ہمارے نزدیک لاکھوں ستم زدہ بلوچ عوام کی مصیبتوں کا واحد حل صحیح معنوں میں عوام کے دکھوں کے علاج کے لیے بلوچستان کی قومی ولسانی بنیادوں پر تشکیل ہے۔ ہمارا مقصد لوگوں کو کسی پرفریب تخیل سے مسحور کرکے اور ان کے جذبات کو ابھار کر انہیں خودکشی پر آمادہ کرنا نہیں ہے۔ اس لیے ہم الفاظ کا سہارا لے کر عہد ناموں کے حوالے سے چند ایسے بااقتدار لوگوں کی ترجمانی کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں جو لاکھوں انسانوں کی تباہی و بربادی کا موجب، ان کی بدحالی و پسماندگی کا سبب اور ان کی ترقی و خوش حالی میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

ہمیں اعتراف ہے کہ ہم اپنے چند دوستوں سے اختلاف اور خداوندانِ اقتدار کی خلاف ورزی کے مرتکب ہورہے ہیں، جس سے ان کی جبینوں کا شکن آلود ہونا یقینی ہے۔ لیکن ہمیں اپنے مؤقف کی صحت پر اعتماد اور اپنے خلوص پر یقین ہے۔ ہمارا مؤقف کسی تعصب یا طبقاتی منافرت پر مبنی نہیں بلکہ ہمارے نزدیک اس خطہِ ملک کے روشن مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ لسانی اور تہذیبی بنیادوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بلوچ قوم پر مشتمل بلوچستان کے نام سے ایک وحدت قائم کی جائے۔

اس وحدت میں یونین، مستجار اور قبائلی علاقوں کی تفریق ختم کی جائے۔ والیوں، نوابوں اور سرداروں کے امتیازی حقوق ختم کرکے ان کے وظائف بند کردیے جائیں۔ اس نئی وحدت کو بھی فوری طور پر وہی صوبائی خودمختاری دی جائے جو اس وقت پاکستان کے دوسرے صوبوں کو حاصل ہے۔ لوگوں کی فرسودہ مزاجی، کوتاہ بینی، غلط کاری اور قدامت پرستی نے اس سرزمین کے مصائب میں اضافہ کردیا ہے۔ ہمیں ان سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ ہمارے مخاطب تو وہ نوجوان ہیں جنہیں مستقبل کی تاریکیوں میں اپنے وجود سے اجالا کرنا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اس مسئلہ کی اہمیت اور اس کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے وہی راستہ منتخب کریں گے جو آگے کی طرف بڑھتا ہو۔

دنیا میں سب سے زیادہ جواں مردی یہ ہے کہ جب چند مفاد پرست افراد قوم کو گم راہی کے گڑھے میں دھکیلنا چاہیں تو اس وقت سینہ تان کر سچی بات کہہ دی جائے۔

(مشمولہ، تعمیر بلوچستان، 15 اپریل 1954۔ صفحہ 58-55)

عشاق کے قافلے

جلد نمبر		صفحات	قیمت
1	مزدک (سپارٹیکس، تھامس مور، توماسو کمپنیلا، جیرالڈ ونسٹلے،، جین ملیر، سینٹ سائمن، اوون، چارلس فیوریئر، پائرے پرودھون ، میخائل باکونن، نکولائی چرنی شیوسکی، ایڈوارڈ ویلنٹ، پیاتر لاورف، نکولائی میخائیلو فسکی،، جین جاریز، فرڈیننڈ لاسال، آگسٹ بیبل، ویلہلم لب نخت، وولف۔ والٹیر، قراۃ العین طاہرہ)۔	152	300
2	شاہ عنایت شہید	80	150
3	ٹام پین	135	200
4	شاہ لطیف	112	200
5	مست	380	500
6	جینی ویسٹ فالین		
7	کارل لب نخت (روزالگزمبرگ، کلارازیٹکن، فرانز مہرنگ ،ٹرگنیف، ٹالسٹائی، جارجی پلیخانوف)۔	زیرطبع	
8	کروپسکایا	زیرطبع	
9	میکسم گورکی (لونا چرسکی، ٹراٹسکی، جان ریڈ، انتون گراچی، جارجی دیمتروف)۔		
10	یوسف عزیز مگسی	200	395
11	عبدالعزیز کرد (نسیم تلوی، محمد امین کھوسہ، ،عبدالرحمان بگٹی، محمد حسین عنقا، قادر بخش نظامانڑیں، خان عبدالصمد اچکزئی، ملک فیض محمد یوسف زئی)۔	152	250
12	ماؤزے تنگ کم ال سنگ۔	112	200
13	ہوچی منہ (جنزل گیاپ، لی دوان)	120	200
14	فیڈل کاسٹرو (جوزی مارٹی)		
15	چے گویرا (آلندے، شاویز، پبلو نرودا، وکٹر ہارا)۔	زیرطبع	
16	بابو	160	200
17	ملک عبدالرحیم خواجہ خیل (قاضی داد محمد،، ملک محمد پناہ)	زیرطبع	
18	گل خان نصیر	248	200
19	گل خان کے ساتھی	زیرطبع	
20	سی آر اسلم (فیروز الدین منصور، سید مطلبی فرید آبادی)	سٹاک میں نہیں	

21	کرشن چندر (سبطِ حسن،ساحرلدھیانوی ،حبیب جالب،علی عباس جلالپوری، کا کا جی صنوبر حسین،لال خان،نورمحمد چوہان ، خواجہ رفیق ، ملک اسلم، محمد علی بھارا ، اسلم ریڈیو ، فیض احمدفیض،چودھری حفیظ، چودھری فتح محمد، عابدحسن منٹو ، ہرکشن سنگھ سرجیت)	زیرطبع	
22	بابابزنجو	150	300
23	خیربخش مری	زیرطبع	
24	قسورگردیزی (عبدالرحمان کرد، محمد اسلم اچکزئی،ملک محمد پناہ،کرار حسین، لال بخش رند، عبدالرحمٰن غور،زمرد حسین،خلیل صدیقی،،پروفیسر نادر قمبرانی،انور احسن صدیقی،مراد ساحر)	زیرطبع	
25	ماماعبداللہ جان جمالدینی	200	300
26	ڈاکٹرخدائیداد (مراد ساحر ، آزات جمالدینی، نادر قمبرانی،خلیل صدیقی،لال بخش رند،انوراحسن صدیقی)	زیرطبع	
27	سائیں کمال خان شیرانی (صوفی نورمحمد، صاحبزادہ ادریس، ایتھل اور جولیس روزنبرگ)	160	300
28	سوبھوگیان چندانڑیں (حیدربخش جتوئی، شاہ لطیف، امام علی نازش، نذیرعباسی، ابراہیم جویو،شیخ ایاز)	200	200
29	پیٹرس لومبا (گرامچی، بھگت سنگھ، نیلسن منڈیلا،نور محمد ترہ کی،عبدالرحمان پہوال،انجیلا ڈیوس،کرسٹوفر کاڈویل ،وپٹسا روف،محمود درویش۔ہاورڈ فاسٹ)۔		
30	ڈاکٹرامیرالدین (ڈاکٹرفہمیدہ حسین،محمدسرور،اکبر بارکزی ،سائمن غلام قادر،عزیز مینگل، اکرام احمد، محمد علی صدیقی،عبدالستار پردلی،گل بنگلزئی ، دربدرخاک بسر،جاوید اختر،کیسنڈرہ بالچن،سعیدمستوئی،عیسیٰ بلوچ،انواراحمد)	132	250